باغ سے باغ تک
مکمل ناول
طاہر جاوید مغل
PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

رات کا آخری پہر تھا۔ آنیہ جاگ چکی تھی مگر اس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ وہ جانتی تھی...... وہ اس دروازے کی دوسری جانب کھڑا ہے جو دونوں کمروں کو آپس میں ملاتا ہے پھر دروازہ آہستہ سے کھلا...... وہ بے آواز چلتا ہوا اس کے کمرے میں آ گیا۔ آج اسے صبح سویرے نکلنا تھا، یہ بات اس نے آنیہ کو کل شام ہی بتا دی تھی۔ آنیہ نے اس کے کپڑے استری کر دیے تھے اور ضرورت کی دیگر اشیا بھی اس کے کمرے میں میز پر رکھ دی تھیں۔ اس نے کہا تھا کہ وہ آنیہ کو جگائے بغیر نکل جائے گا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بہت دبے پاؤں اس کے بیڈ کی طرف آ رہا تھا۔ کچھ دیر خاموش کھڑا رہا۔ آنیہ وہ مہک محسوس کرتی رہی جو اس کے بدن اور اس کے لباس میں سے اٹھ رہی تھی پھر وہ جھکا۔ اس نے بہت ہولے سے بالوں کی ایک لٹ آنیہ کی پیشانی سے ہٹائی۔ بڑی نرمی سے اس کی پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھے اور تب آواز پیدا کیے بغیر باہر نکل گیا۔ آنیہ کے ہونٹوں پر بے ساختہ ایک دھیمی مسکراہٹ بکھر گئی۔

اُس نے آنکھیں وا کر کے وال کلاک کی طرف دیکھا اور ذرا سا چونکی۔ شام کو اس نے کہا تھا کہ ساڑھے چار بجے کے قریب نکلے گا مگر ابھی تو تین بجے تھے۔ وہ اتنی جلدی کیوں نکل گیا تھا؟ اس کے حوالے سے وہ ہر وقت اندیشے میں مبتلا رہتی تھی۔ اس کا جلدی نکلنا بھی اسے ٹھٹکا گیا۔ وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کھڑکیوں سے باہر دسمبر کی یخ بستہ رات کا سناٹا تھا۔ بالائی منزل پر خاموشی تھی۔ اس نے ایک بار پھر آنکھیں سکیڑ کر وال کلاک کو دیکھا اور اپنے بال سمیٹتی ہوئی بستر سے اٹھ گئی۔ چپل گھسیٹ کر وہ جلدی سے دیوار گیر الماری کی طرف بڑھی۔ الماری کے ایک بڑے خانے میں کمبل اور لحاف وغیرہ رکھے تھے۔ اس نے سب سے نیچے موجود ایک لحاف کو دیکھا اور اسے کھینچ کر باہر نکال لیا۔ اس کا دل جیسے چند لمحوں کے لیے دھڑکنا بھول گیا۔ ویلوٹ کا براؤن لحاف ایک جانب سے کٹا ہوا تھا۔ روئی باہر نکلی ہوئی تھی اور وہ پستول غائب تھا جو آنیہ نے یہاں چھپایا تھا۔

''اوہ مائی گاڈ۔'' اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

پھر اس نے شال اوڑھی، دروازہ کھولا اور تیزی سے باہر نکل کر سڑک پر آ گئی۔ وہ ابھی اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کر رہا تھا۔ وہ چیل کی طرح اس پر جھپٹی اور اسے دونوں کندھوں سے تھام لیا۔ ''یہ کیا کر رہے ہو تم...... کہاں جا رہے ہو؟'' وہ سرسراتی آواز میں بولی۔

''کیا ہو گیا ہے آنیہ؟ تمہیں بتایا تو تھا۔''

آنیہ نے جلدی سے ہاتھ چلایا اور اس کی سیاہ جیکٹ کے نیچے کولٹ پسٹل کی سختی کو محسوس کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے موٹر بائیک کی چابی نکالنے کی ناکام کوشش کی۔ وہ اس کے ہاتھ کو سختی سے پیچھے دھکیل کر بولا۔ ''کیا کر رہی ہو آنیہ؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟''

آنیہ نے شہادت کی انگلی اٹھائی اور ہیجانی انداز میں بولی۔ ''تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا...... تم نے وعدہ کیا تھا مجھ سے...... اب رک جاؤ گے۔ لیکن تم نہیں رک رہے۔ تم پھر اسی کی طرف جا رہے ہو۔ میں تمہیں یہ نہیں کرنے دوں گی۔ ہرگز نہیں کرنے دوں گی۔'' اس نے دونوں ہاتھوں سے بائیک کا ہینڈل پکڑ لیا۔

''تمہیں غلط فہمی ہو رہی ہے آنیہ۔ میں ایسا کچھ نہیں کر رہا۔ یہ پسٹل تو صرف احتیاطاً لے کر جا رہا ہوں۔''

''نہیں، میں سب جانتی ہوں۔ تمہاری رگ رگ سے واقف ہو گئی ہوں...... پلیز پلیز...... مت کرو ایسا۔ میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ تمہیں پتا ہے میں نہیں رہ سکوں گی تمہارے بغیر...... تمہیں کچھ ہو گیا تو میں بھی نہیں رہوں گی۔ مجھے اس طرح برباد مت کرو۔''

''ایسا کچھ نہیں ہے۔'' اس نے آنیہ کو پیچھے دھکیلا۔ ''میں وہیں جا رہا ہوں جہاں کا تمہیں بتایا تھا اور اگر......''

یکایک وہ چپ ہو گیا۔ رات کے سناٹے میں کسی قریبی سڑک سے سائرن کی آواز آنا شروع ہو گئی تھی۔ وہ دونوں اچھی طرح جانتے تھے یہ کسی پولیس موبائل کا سائرن تھا...... آواز نزدیک آ رہی تھی۔

''آنیہ۔'' وہ سخت لہجے میں بولا۔ ''میرے پاس وقت نہیں ہے۔ خواہ مخواہ مجھے اور خود کو خطرے میں نہ ڈالو۔ اندر جاؤ۔ میں نے کہا ناں، شام سے پہلے میں واپس آ جاؤں گا۔ میں وعدہ کر رہا ہوں تم سے۔ فار گاڈ سیک اندر جاؤ...... فار گاڈ سیک۔'' اس نے بے قراری کے عالم میں آنیہ کو دھکا دیا۔ تاریکی میں آنیہ کو کسی چیز سے ٹھوکر لگی اور وہ لڑکھڑا کر پشت کے بل ایک دیوار سے جا ٹکرائی۔ اس کی چوڑیاں ٹوٹنے کی آواز آئی۔ اس دوران میں وہ موٹر بائیک اسٹارٹ کر چکا تھا۔ پولیس کار کا سائرن بتدریج بلند ہوتا جا رہا تھا۔ کار یا جیپ یقیناً اسی جانب آ رہی تھی۔ اس نے بائیک کو گیئر میں ڈالا۔ بائیک کا پچھلا پہیا چرچرایا اور وہ تیزی سے آگے بڑھی۔ ''پلیز رک جاؤ...... پلیز۔'' آنیہ نے ایک بار پھر پکارا مگر تب تک وہ یخ بستہ تاریکی کا سینہ چیرتا ہوا

www.pakistanipoint.com

آگے بڑھ چکا تھا۔

وہ سکتہ زدہ سی اپنی جگہ کھڑی رہ گئی۔ گرم آنسو اس کے رخساروں پر پھسلنے لگے۔ سائرن کی آواز مزید نزدیک آگئی تھی۔ اس نے خوف زدہ انداز میں عقب میں دیکھا اور پھر جلدی سے دروازہ کھول کر گھر میں داخل ہوگئی۔

دروازہ اندر سے بند کر کے وہ لڑکھڑاتی ہوئی اسی کمرے کی نیم گرم فضا میں پہنچی اور بستر پر اوندھی گر کر ہچکیوں سے رونے لگی۔ اس کے سینے میں تلاطم بپا تھا۔ پورا جسم لرز رہا تھا۔ سائرن کی آواز اب دور ہوتی چلی جارہی تھی۔ کیا وہ زندہ واپس آئے گا؟ کیا وہ اسے پھر دیکھ سکے گی؟ یہ سوال بار بار ایک دہکی ہوئی میخ کی طرح اس کے دماغ میں پیوست ہورہا تھا۔

کئی منٹ بعد وہ سیدھی ہوئی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ چہرہ بارش میں دھلے سفید گلاب کی طرح نظر آتا تھا۔ ٹوٹنے والی چوڑیوں نے اس کی سرخ و سپید کلائی پر گہری خراشیں ڈال دی تھیں۔ اس نے رسنے والا خون ٹشو پیپر سے صاف کیا۔ تب ایک بار پھر اپنے بال سمیٹے، کندھوں پر شال کو درست کیا اور بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ آنکھوں میں آئی ہوئی نمی کے سبب کمرے کی کھڑکی کا منظر دھندلا دکھائی دیتا تھا۔ کھڑکی سے باہر گھر کے صحن میں سفیدے کے پیڑ نیم تیرگی میں خاموش کھڑے تھے۔ بالائی منزل کے کمرے سے ماموں جی کے کھانسنے کی آواز آرہی تھی۔ کھڑکی کی چوکھٹ پر ایک اسٹیکر چسپاں تھا، تقریباً دس انچ ضرب چار انچ کا ہوگا۔ اس پر لکھا تھا۔ ”ہم نہیں مانتے...... ظلم کے ضابطے۔“ نیچے انگوٹھے کا نشان تھا۔ مگر لگتا تھا کہ اسٹیکر پر یہ نشان روشنائی سے نہیں، کسی اور چیز سے لگایا گیا ہے۔ شاید خون سے۔ اس نشان کی بہت اہمیت تھی آنیہ کے نزدیک...... یہ نشان اس اندوہناک واقعے کی نشانی تھی جو کچھ عرصہ پہلے پیش آیا تھا اور ہمیشہ کے لیے اس کے دل و دماغ پر نقش ہو چکا تھا۔

آنیہ کی نگاہیں اس کھڑکی پر اور اس اسٹیکر پر جمی رہیں...... وہ خیالوں ہی خیالوں میں جیسے کہیں بہت دور پہنچ گئی...... وہ ماضی کی بھول بھلیوں میں گم ہوگئی تھی۔ چند مہینے پہلے کے مناظر اس کے پردۂ تصور پر نمودار ہوئے اور ایک ترتیب کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔

چند ماہ پہلے وہ جالندھر میں تھی۔ جالندھر میں زیادہ مسلمان تو نہیں تھے پھر بھی کئی علاقوں میں وہ رہائش رکھتے تھے۔ آنیہ کے والد بیرسٹر خورشید عالم بھی وہاں کے رہائشی تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو خواہش رکھنے کے باوجود تقسیم کے وقت پاکستان نہیں گئے اور اب بھی انڈیا میں آباد ہیں۔ بہار کالونی کی ایک کینال کی کوٹھی میں آنیہ اپنے والدین اور دو چھوٹے بھائیوں کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ کمپیوٹر سائنس میں بیچلر کر چکی تھی جبکہ بھائیوں میں سے ایک سیکنڈ ایئر اور دوسرا میٹرک میں تھا۔ اس کوٹھی میں ایک بڑا بیسمنٹ بھی تھا۔ اس بیسمنٹ کا ایک حصہ کتب خانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس کتب خانے میں زیادہ تر کتابیں تو آنیہ کے والد خورشید عالم صاحب کی تھیں تاہم چند الماریوں میں اس کے پڑدادا کے زمانے کی کچھ کتابیں اور مخطوطے بھی محفوظ تھے۔ اس کے پڑدادا ہاشم علی کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ بڑے اچھے فوٹو گرافر بھی تھے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب اسٹل کیمرا ابھی لوگوں کے لیے ایک انوکھی اور نئی چیز تھی۔ اس کے پڑدادا ہاشم علی کا زمانہ وہی تھا جب ہندوستان میں تحریک آزادی زوروں پر تھی۔ پورے ہندوستان میں لگی ہوئی آگ کے شعلے بتدریج بلند ہورہے تھے۔ امرتسر میں جب جلیانوالا باغ کا تاریخی واقعہ ہوا، آنیہ کے پڑدادا ہاشم علی کی عمر قریباً پچیس برس ہوگی۔ بے شمار دوسرے ہندوستانیوں کی طرح ہاشم علی نے اپنی آنکھوں میں انگریزوں سے آزادی کا سپنا سجا رکھا تھا۔ شوقیہ فوٹو گرافر ہونے کے باوجود انہوں نے سانحۂ جلیانوالا اور اس طرح کے کئی دیگر واقعات کی تصویر کشی کی تھی۔ پرانے کوڈک کیمرے سے کھینچی گئی وہ بلیک اینڈ وائٹ تصویریں انہوں نے ایک خودساختہ البم میں محفوظ کر رکھی تھیں۔ اس البم کی خصوصیت یہ تھی کہ اکثر تصویروں کے نیچے ہاشم علی نے اپنے ہاتھ سے تصویروں کا پس منظر اور ان کی اہمیت بھی لکھی تھی۔

آنیہ کو اپنے جدِامجد کی نشانیوں اور خاص طور سے اس البم میں بہت دلچسپی تھی۔ وہ لاڈلی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سیلانی لڑکی بھی تھی۔ بس جو بات دماغ میں سما گئی، وہ سما گئی۔ ماما کے منع کرنے کے باوجود وہ اکثر تہ خانے میں گھس جاتی اور ان پرانی اشیا میں کھوئی رہتی۔ کبھی کبھی اس پر پینٹنگ کا بھوت بھی سوار ہوجاتا تھا۔

بی سی ایس کا رزلٹ اناؤنس ہو چکا تھا اور اب ماسٹرز میں داخلے تک وہ فارغ ہی تھی۔ اس دن بھی ناشتے کے بعد اپنے موبائل پر ایک دو سہیلیوں سے ہیلو ہائے کرنے کے بعد وہ بیسمنٹ میں گھس گئی۔ بلیک اینڈ وائٹ تصویروں والا البم ابھی تک مطالعے کی میز پر ہی رکھا تھا۔ اس نے ہیڈ فون لگایا اور میوزک سننے کے ساتھ ساتھ البم کے ورق پلٹنے لگی۔

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

ابتدائی حصے میں ایک تصویر ہمیشہ اس کی توجہ کو جذب کر لیتی تھی۔ آج بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ اس بلیک اینڈ وائٹ تصویر کو خصوصی دلچسپی سے دیکھتی چلی گئی اور پھر اس کے نیچے لکھی ہوئی وہ تحریر پڑھنے لگی جو لگ بھگ سو سال پہلے اس کے پڑدادا ہاشم علی نے لکھی تھی۔ صاف ستھری لکھائی تھی۔ ایک زمانہ گزرنے کے باوجود روشنائی کے رنگ میں معمولی فرق پڑا تھا۔ تصویر قدرے زرد ہو چکی تھی مگر اب بھی منظر بالکل واضح تھا۔

آنیہ نے ایک طویل سانس لی، ہیڈ فون اُتارا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر تصویر کو بغور دیکھنے لگی۔ یہ ٹھیک سو سال پرانی تصویر جلیانوالا باغ کی تھی۔ یہ اس قیامت کی منظر کشی تھی جو 1919ء میں امرتسر کے اندر عوام کے ایک جم غفیر پر ٹوٹی تھی۔ اپریل کا مہینا تھا اور 13 تاریخ تھی۔ انگریزوں سے آزادی مانگنے والے ہزاروں لوگ اپنے نگارسینوں کے ساتھ اس باغ میں جمع ہوئے تھے۔ ان میں سکھ، ہندو، مسلمان سب شامل تھے اور پھر جنرل ڈائر نام کے ایک درندے نے ان پر موت کی بارش کر دی تھی۔

زیرِ نظر تصویر میں ایک شخص کمر پر گولی کا زخم لے کر زمین پر اوندھا پڑا تھا۔ اس کے اردگرد بھاگتے دوڑتے لوگوں کے پاؤں اور پنڈلیاں نظر آ رہی تھیں۔ نو دس سال کا ایک بچہ بھی اس تصویر میں موجود تھا۔ وہ اس زخمی کا بیٹا تھا۔ وہ اپنے باپ پر اوندھا گرا ہوا تھا، جیسے اسے مزید گولیوں سے اور ان لاٹھیوں سے بچانا چاہتا ہو جو عالمِ وحشت میں آفت زدہ لوگوں پر برسائی جا رہی تھیں۔ بچے نے باپ کو اپنی بانہوں کے گھیرے میں لیا ہوا تھا...... اور پلٹ کر اس سپاہی کی طرف دیکھ رہا تھا جس نے اس کے باپ کو مارنے کے لیے لاٹھی دونوں ہاتھوں میں اٹھا رکھی تھی۔ بچے کی آنکھوں میں نظر آنے والی چمک بے مثال تھی۔ اس میں خوف تو بے شک تھا مگر اس میں ایک آگ بھی تھی۔ ایک نر شیر کی سی دلیری، بے خوفی اور غضب ناکی۔ اس چمک نے اس فوٹوگراف کو یادگار بنا دیا تھا۔

اس تصویر کے نیچے آنیہ کے جدِ امجد ہاشم علی نے جو دو تین پیراگراف لکھے تھے، وہ بھی اپنی جگہ یادگار تھے۔ آنیہ انہیں کئی مرتبہ پڑھ چکی تھی۔ اس تحریر میں انہوں نے اس تصویر کا سیاق و سباق بیان کیا تھا۔ انہوں نے تصویر کا عنوان ''شیر بچہ'' رکھا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا۔

''میں قیامت کی اس شام، خود جلیانوالا باغ میں موجود تھا۔ میں انگریز حاکموں کی اس ناقابلِ بیان سفاکی اور درندگی کا چشم دید گواہ ہوں۔ اس وحشی جنرل ڈائر نے اپنے ایک بیان میں خود کہا ہے، میں نے ہجوم کو منتشر کرنے کے لیے نہیں ان کو سزا دینے کے لیے گولی چلوائی تھی اور اس وحشی کی اس سزا نے سیکڑوں بے گناہوں کو خاک و خون میں نہلا دیا۔ سیکڑوں جاں بہ لب ایسے تھے جن کے لیے طبی امداد کے راستے مسدود کر دیے گئے اور انہوں نے تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ مقامی ذرائع کے مطابق 1000 سے زائد لوگ اس بے رحمانہ فائرنگ کی بھینٹ چڑھے۔ یہ تصویر ایک ایسے مسلمان بچے کی ہے جو اپنے زخمی باپ کو بچانے کے لیے اس کے اوپر گر گیا تھا اور ''ابا ابا'' پکار رہا تھا۔ گولیاں اس کے سر کے اوپر سے گزرتی رہیں اور وہ اپنے باپ سے چمٹا رہا۔ وہ اپنے باپ پر برسنے والی گولیوں اور لاٹھیوں کے لیے ایک ڈھال بن گیا۔ یہ تصویر اتارے جانے کے چند سیکنڈ بعد وہ اپنے باپ کے دفاع میں دیوانہ وار ایک سپاہی کی ٹانگوں سے چمٹا اور اسے گرا دیا۔ اسی دوران میں ایک اور شخص اس کی مدد کو پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ مل کر اس نے اپنے زخمی باپ کو گھسیٹا اور خطرے والی جگہ سے دور لے گیا۔ میری معلومات کے مطابق وہ زخمی شخص ان قریباً 1500 زخمیوں میں شامل تھا جو بعدازاں زیرِ علاج ہوئے اور مختلف اسپتالوں میں پہنچائے گئے۔ اس دس سالہ بچے کی حیران کن شجاعت کا بس دس بیس فیصد حصہ ہی اس فوٹوگراف میں قید ہو پایا ہے، باقی میں نے اپنی نگاہوں سے دیکھا اور میرے حافظے میں ہمیشہ کے لیے نقش ہو گیا۔

پتا نہیں کیوں، اس روزنہ خانے میں بیٹھے بیٹھے اور اس تصویر کو دیکھتے دیکھتے آنیہ کے ذہن میں ایک عجیب خیال آیا۔ تصویر 1919ء کی تھی اور اب 2019ء تھا، پورے سو سال گزر چکے تھے اس تصویر کو۔ ان سو سالوں میں کیا کچھ ہو چکا تھا۔ یقیناً یہ شجاع لڑکا جوان ہو کر اور پھر شاید بوڑھا ہو کر مر چکا تھا۔ اس کے بچے بھی مر چکے ہوں گے، اب شاید تیسری نسل ہو گی۔ کون تھا یہ بچہ؟ کس فیملی سے تعلق رکھتا تھا۔ اب کہاں تھے یہ لوگ؟ کئی سوال یکایک آنیہ کے ذہن میں اُبھر آئے۔ آنیہ کے جدِ امجد ہاشم علی نے اسے کسی نڈر اور بہادر فیملی کا ''شیر بچہ'' قرار دیا تھا۔ اس شیر بچے کی زندگی کہاں اور کیسے گزری، اور اب اس کی اولاد کہاں ہے؟

☆☆☆

آنیہ اپنی سفید آلٹو کار میں سوار امرتسر کی طرف جا رہی تھی۔ اس کی منزل امرتسر کی بڑی پبلک لائبریری تھی۔ یہاں اسے ایک سکھ لڑکی نہار کور سے ملنا تھا۔ نہار

www.pakistanipoint.com

ویسے تو لائبریرین تھی مگر اسے ہسٹری سے خاص دلچسپی تھی۔ آنیہ کو معلوم ہوا تھا کہ نہار کور نے جلیانوالا باغ کے سانحے پر کافی کام کیا ہے۔ خاص طور سے اس نے اس سانحے میں مرنے اور زخمی ہونے والوں کے درست اعداد و شمار جمع کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے علاوہ ان فیملیز کا بھی سراغ لگایا تھا جن کی زندگیاں کسی نہ کسی طور اس اندوہناک واقعے سے متاثر ہوئی تھیں۔

یہ ساری باتیں آنیہ کو تین روز پہلے اپنے پاپا سے ہی پتا چلی تھیں۔ آنیہ کے پاپا بھی اس تصویر کے بارے میں یہ خوب جانتے تھے جو تہ خانے میں رکھے البم کے ایک پیج پر پچھلے قریباً سو برس سے موجود تھی۔ اپنی آنکھوں میں شیر جیسی دلیری کی چمک رکھنے والے بچے کی تصویر نے اس کے پاپا کو بھی متاثر کیا تھا بلکہ وہ ایسی تصویر تھی جو ہر دیکھنے والے کو متوجہ کر لیتی تھی۔ تین روز پہلے آنیہ نے پاپا کو بتایا تھا کہ وہ اس تصویر کے حوالے سے کچھ کھوجنا چاہتی ہے۔ پاپا سمجھ گئے تھے کہ اب جو کچھ آنیہ کے دماغ میں آگیا ہے، وہ کر کے رہے گی۔ پاپا اس کی کچھ زیادہ مدد تو نہیں کر سکتے تھے تاہم انہوں نے اسے اس لائبریرین نہار کور کا پتا بتا دیا تھا اور امید ظاہر کی تھی کہ شاید آنیہ کو اس سے کچھ معلوم ہو سکے۔

نہار کور مضبوط ہاتھ پاؤں اور لمبے ریشمی بالوں والی ایک قبول صورت لڑکی تھی۔ ابھی غیر شادی شدہ تھی اور اپنی والدہ کے ساتھ اندرونی شہر کے ایک کشادہ گھر میں رہتی تھی۔ جالندھر سے ٹرنک روڈ کے ذریعے قریباً ڈیڑھ گھنٹے کا سفر کر کے آنیہ امرتسر پہنچ گئی تھی۔ نہار کور سے اس کی ملاقات لائبریری کے ریڈنگ روم کی ایک میز پر ہوئی۔ آنیہ اپنے اسمارٹ فون میں البم کی وہ خاص تصویر اور اس کے نیچے لکھی ہوئی تحریر کا عکس بھی لے کر آئی تھی۔

نہار کور کو بھی اس تصویر اور اس تحریر میں دلچسپی محسوس ہوئی۔ اسے یہ جان کر بھی خوشی محسوس ہوئی کہ آنیہ اسی کی طرح رومانی مزاج کی لڑکی ہے۔ فینٹسی پر یقین رکھتی ہے اور ماضی کے اوراق پلٹتے ہوئے ایک شاندار تصویر پر تحقیق کرنا چاہتی ہے۔ دونوں میں سیر حاصل گفتگو ہوئی اور نہار کور نے وہ تصویر اور تحریر اپنے موبائل میں لے لی۔ نہار نے آنیہ سے وعدہ کیا کہ اس سلسلے میں آنیہ کی جو مدد بھی ہو سکی، وہ کرے گی۔ نہار کور نے جلیانوالا کے حوالے سے جو اعداد و شمار اکٹھے کر رکھے تھے، ان میں چالیس پچاس مسلمانوں کا ذکر بھی تھا۔ ان میں سے کچھ جان سے گئے تھے اور کچھ زخمی ہوئے تھے۔ کم از کم بیس افراد ایسے تھے جن کی فیملیز کے بارے میں بھی معلومات موجود تھیں۔

آنیہ نے نہار کور کو تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔ ''نہار! یہ ایک کلیو ایسا ہے جو شاید تمہاری کچھ مدد کر سکے۔'' اس نے تصویر پر ایک جگہ انگلی رکھی۔

نہار نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں، یہ چیز میں نے بھی نوٹ کی ہے۔ زخمی باپ کے جسم پر ایک پرانی فوجی قمیص ہے۔ اس طرح کا لباس برٹش انڈین آرمی کا ہوتا تھا۔''

''مطلب یہ ہوا کہ یہ شخص فوجی تھا، یا ہو سکتا ہے کہ سابق فوجی ہو۔ تم اس اینگل سے کوشش کرو تو شاید کوئی کھوج مل جائے۔''

نہار ایک بار پھر اثبات میں سر ہلانے لگی۔ اس کی نگاہیں بدستور تصویر کے عکس پر جمی ہوئی تھیں۔

☆☆☆

تصویر والی بات کچھ اس طرح آنیہ کے دماغ میں سمائی تھی کہ نکل ہی نہیں رہی تھی۔ نہار کور سے ملے ہوئے اسے اب آٹھ دس روز ہو چلے تھے۔ وہ دو بار نہار کو فون بھی کر چکی تھی۔ لائبریری میں کوئی فنکشن تھا جس کی وجہ سے نہار کی مصروفیت بڑھی ہوئی تھی۔ تاہم اس نے آنیہ کو تسلی دی تھی کہ دو چار روز میں وہ اسے کچھ نہ کچھ معلومات ضرور فراہم کرے گی۔

آج بھی آنیہ بیسمنٹ میں گم صم بیٹھی تھی۔ والد کورٹ جا چکے تھے۔ دونوں چھوٹے بھائی بھی اپنے اپنے کام سے نکل چکے تھے۔ وہ مطالعے کی میز پر بیٹھی ایک پرانی کتاب کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ اتنے میں بیسمنٹ کا دروازہ دھڑ دھڑ بجا۔ اپنے خیالوں سے چونک کر اس نے دوپٹا اپنے سینے پر درست کیا اور دروازہ کھولا۔ دوسری طرف ماما کھڑی تھیں۔

''کیا ہوا ماما؟'' آنیہ نے پوچھا۔

ماما کے چہرے پر بیزاری تھی۔ ''آنو! کیا ہر وقت یہاں گھسی رہتی ہو، کچھ دین دنیا کی خبر بھی رکھا کرو۔ فرحان ڈرائنگ روم میں آیا بیٹھا ہے۔''

آنیہ نے ایک طویل سانس خارج کی اور کندھے ڈھیلے چھوڑ دیے۔ رسٹ واچ دیکھی۔ دوپہر کے بارہ بجنے والے تھے۔ اسے پہلے ہی اندیشہ تھا کہ فرحان آ ٹپکے گا۔ فرحان اس کا خالہ زاد تھا، عمارتی لکڑی کا کام کرتا تھا۔ اس کا شمار جالندھر کے گنے چنے تاجران میں ہوتا تھا۔ اس کے والد نے بھی اس کام میں نام اور پیسا کمایا تھا۔ پچھلے کچھ عرصے سے آنیہ اور فرحان کے رشتے کی بات بھی چل رہی تھی۔

www.pakistanipoint.com

آنیہ ٹھنک کر بولی۔ ''پلیز ماما! کسی طرح اسے ٹال دیں۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

وہ دبی آواز میں بولیں۔ ''کیا بے وقوفوں جیسی باتیں کر رہی ہو۔ تمہیں پتا ہے، وہ تم سے ملنے آیا ہے۔ کوئی غیر تو نہیں۔ تمہارا خالہ زاد ہے۔ تم پہلے بھی تو اس کے ساتھ جاتی رہی ہو۔ اب ایسی کیا بات ہوگئی ہے؟''

''اب ہوگئی ہے ناں ماما۔ آپ لوگ مجھے پھنسا رہے ہیں۔'' وہ پھر ٹھنکی۔

''اچھا بند کرو بکواس۔ وہ باہر بیٹھا ہے۔ کتنی چاہت سے آتا ہے، نئی گاڑی لی ہے۔ سب سے پہلے تمہیں دکھانے آیا ہے۔''

''اُف یہ نئی گاڑی۔'' آنیہ نے ماتھے پر ہاتھ مارا اور اپنا لباس درست کرتی ہوئی ماما کے ساتھ باہر آگئی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ اور فرحان چمچاتی ''ہنڈائی کار'' پر سی سینٹر کی طرف جا رہے تھے۔ فرحان اسے لنچ کرانا چاہ رہا تھا۔ فرحان کی عمر اٹھائیس کے قریب رہی ہوگی۔ اس کا جسم تھوڑا سا فربہ تھا، پیشانی سے بال اُڑے ہوئے تھے مگر مجموعی طور پر وہ قبول صورت تھا۔ اس وقت بھی کلف دار شلوار قمیص اور واسکٹ میں وہ جچ رہا تھا۔ کوئی ایسی خاص کمی نہیں تھی اُس میں۔ آنیہ کو بہت پسند بھی کرتا تھا لیکن پتا نہیں کیا بات تھی، بطور ایک شریکِ حیات وہ کبھی بھی آنیہ کو بھایا نہیں تھا۔

''گاڑی کا نمبر پڑھا ہے تم نے؟'' اس نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں تو۔''

''گولڈن نمبر ہے۔ تین زیرو والا، ایک لاکھ تو اس نمبر کا ہی دینا پڑا ہے۔'' اس نے حسبِ عادت امارت کا اظہار کیا۔

''تو کیا ایسے نمبر کی وجہ سے گاڑی زیادہ آرام دہ ہو جاتی ہے؟'' آنیہ نے پوچھا۔

وہ زور سے ہنسا۔ ''آرام دہ تو نہیں ہوتی لیکن کچھ جلنے والوں کے لیے تکلیف دہ ضرور ہو جاتی ہے۔''

''لیکن ہمیں دوسروں کی تکلیف کے بجائے اپنے آرام اور خوشی کا زیادہ خیال رکھنا چاہیے۔''

''بھئی اسی لیے تو جا رہے ہیں۔ بتاؤ کیا کھانا پسند کرو گی۔ چائنیز یا پھر کانٹی نینٹل۔ ویسے ذاتی طور پر تو مجھے دیسی کھانے ہی زیادہ پسند ہیں۔ مٹن گوشت کی کڑاہی ہو اور......''

''اور ڈھیر ساری ہو۔'' آنیہ نے اُس کی بات اُچکی۔

وہ دونوں ہنسنے لگے۔

فور اسٹار چائنیز ریسٹورنٹ میں وہ لنچ سے بمشکل فارغ ہوئے ہی تھے کہ آنیہ کے فون پر نہار کور کی کال آگئی۔

''ہیلو نہار! کیا حال ہے؟'' آنیہ نے پوچھا۔

''حال اچھا ہے، اور خبر بھی اچھی ہی ہے۔''

آنیہ کا جسم سنسنا اٹھا۔ ''مطلب کہ پیش رفت ہوئی ہے؟''

''بالکل ہوئی ہے...... مجھے لگتا ہے کہ میں ''شیر بچے'' کی فیملی کا سراغ لگانے میں کافی حد تک کامیاب رہی ہوں...... تم اس وقت کہاں ہو؟''

''ایک کام سے ہی نکلی ہوئی ہوں۔''

''آنیہ جانی! اگر اس وقت یہاں آسکو تو بہت اچھا ہو، کل مجھے دفتری کام سے دہلی جانا ہے پھر دو تین روز تو لگ جانے ہیں۔''

''...... آچھا...... میں کوشش کرتی ہوں...... بلکہ میں آرہی ہوں۔ کہاں ملو گی تم؟''

''لائبریری شام سات بجے تک کھلی ہے، میں وہیں پر ہوں۔''

''اوکے...... میں پھر نکلتی ہوں۔'' آنیہ نے بے تابی سے کہا۔

سلسلہ منقطع کرنے کے بعد اس نے فرحان کی طرف دیکھا۔ فرحان کے چہرے پر مایوسی آمیز جھنجلاہٹ تھی۔

''کیا ہوا اب؟'' اس نے پوچھا۔

''فرحان! میری ایک دوست نہار کور کا فون تھا۔ یہ امرتسر میں لائبریرین ہے، میں اس کے ساتھ مل کر ایک آرٹیکل پر کام کر رہی ہوں، میرا ابھی اس کے پاس پہنچنا بہت ضروری ہے۔ آئی ایم ویری ساری فرحان۔''

لائبریری اور آرٹیکل وغیرہ کے ذکر نے فرحان کو مزید ڈسٹرب کیا۔ اسے ایسے معاملات میں بالکل دلچسپی نہیں تھی۔ ویسے بھی اس کی تعلیم واجبی سی تھی۔ بس اتنی ہی جتنی حساب کتاب اور کاروباری سودے کرنے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔

وہ بولا۔ ''یہ کن بکھیڑوں میں پڑی رہتی ہو آنیہ ڈارلنگ۔ ایسے کاموں سے حاصل وصول کچھ نہیں ہوتا۔ دیکھو اتنا پیارا چہرہ کتابیں پڑھ پڑھ کر کملاتا جا رہا ہے۔ اگر کتابوں میں ہی سر کھپانا تھا تو پھر خالو خورشید کی طرح قانون شانون کی کتابیں پڑھتیں۔ کچھ فائدہ تو ہوتا۔''

www.pakistanipoint.com

''وکیل بیویوں کو سنبھالنے میں دانتوں پسینا آجاتا ہے۔'' وہ ذرا شوخی سے بولی اور اپنا شولڈر بیگ اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

فرحان احمد اپنا سامنہ لے کر رہ گیا۔ اُس کی آنکھوں کی گہرائی میں کہیں غصے کی جھلک نظر آتی تھی۔

☆☆☆

جالندھر سے امرتسر کا فاصلہ اپنی سوزوکی آلٹو گاڑی پر آنیہ نے قریباً ڈیڑھ گھنٹے میں طے کیا اور لائبریری میں نہار کے پاس جا پہنچی۔ اب ان دونوں نے کولڈ کافی کے کپ اپنے سامنے رکھے ہوئے تھے اور مصروفِ گفتگو تھیں۔ دونوں کے چہروں پر دبا دبا جوش نظر آرہا تھا، ان کی نگاہیں سامنے رکھے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر تھیں۔

نہار کہہ رہی تھی۔ ''یہ دیکھو آنیہ جانی! یہ ان بیس پچیس افراد کا ڈیٹا ہے جو مسلمان تھے اور جلیانوالا میں شہید یا زخمی ہوئے۔ ان میں سے یہ ایک شخص تاج محمد حیدر برٹش انڈین آرمی میں نائب صوبیدار تھا۔ یہ 1917ء تک برٹش آرمی میں ہی تھا اور بے شمار دیگر ہندوستانیوں کی طرح اپنے انگریز آقاؤں کی جنگ فرانس میں لڑ رہا تھا۔ یہ سب لوگ جرمنی اور اس کے اتحادیوں سے برسرِپیکار تھے اور ایک ایسے کاز کے لیے سات سمندر پار، اپنا خون بہا رہے تھے جو ان کا کاز تھا ہی نہیں۔ ایک خونریز جھڑپ میں تاج محمد حیدر کے سینے پر شدید ضرب آئی۔ جس نے بعدازاں سخت سردی کی وجہ سے نمونیے کی شکل اختیار کر لی۔ بیماری کے بعد 1917ء کے وسط میں تاج محمد کو فوج سے فارغ کر کے واپس انڈیا بھیج دیا گیا تھا۔ میری تحقیق کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ جلیانوالا باغ کے اندر زخمی حالت میں گرا ہوا شخص وہی سابق صوبیدار تاج محمد ہے...... اور اس کے اوپر گرا ہوا بچہ اس کا بڑا بیٹا اسداللہ ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ہمارے پاس اسداللہ کی ایک اور تصویر بھی موجود ہے۔ اس تصویر میں وہ دس سالہ بچہ نہیں بلکہ ایک کڑیل جوان ہے، دیکھنا چاہو گی؟''

دنیا جہان کا تجسس آنیہ کی آنکھوں میں سمٹ آیا۔

''دکھاؤ پلیز! وہ مٹھیاں بھینچ کر سرخ گلابی چہرے کے ساتھ بولی۔

نہار نے کی پیڈ سے تھوڑی سی چھیڑ چھاڑ کی اور اسکرین پر ایک فوجی دستے کا گروپ فوٹو نظر آنے لگا۔ نہار نے کہا۔ ''لیکن یہ پہلی جنگِ عظیم کی نہیں دوسری کی تصویر ہے۔ یہ زمانہ ہے قریباً 1942ء کا۔ یعنی 1919ء میں جو لڑکا دس سال کا تھا وہ قریباً 32 سال کا ہو چکا تھا۔ اس گروپ میں پہچاننے کی کوشش کرو کہ وہ کون ہے؟''

آنیہ نے دانتوں میں انگلی دبا کر چند لمحے سوچا اور پھر چوڑے سینے اور روشن چہرے والے ایک دراز قد فوجی پر انگلی رکھ دی۔

''زبردست...... بھئی مان گئے تمہیں۔'' نہار نے آنکھیں نچائیں۔ ''یو آر ایبسولیوٹلی رائٹ...... یہی ہے وہ شیر بچہ۔ اس نے بھی اپنی معاشی مجبوریوں کے تحت آرمی جوائن کی۔ وہ لیفٹیننٹ سے کیپٹن کے عہدے پر ترقی پانے والا تھا جب اس نے ایک انگریز میجر پر حملہ کیا اور اسے شوٹ کر کے فرار ہو گیا۔ 1947ء تک کوشش کے باوجود اس کا اور اس کے اہلِ خانہ کا سراغ نہیں ملا۔ آزادی کے بعد وہ واپس آیا اور مشرقی پنجاب کے ہی کسی شہر میں رہائش اختیار کی۔ اس کے چار بچے تھے...... باقیوں کے بارے میں تو کچھ معلوم نہیں تاہم اس کا سب سے چھوٹا بیٹا تیمور حیدر کافی معروف ہوا۔ وہ ایک زبردست کوہ پیما تھا۔ یعنی اپنے بزرگوں کی طرح اس نے بھی ایک دلیرانہ پیشہ اپنایا۔ اس نے 800 میٹر تک کی کئی چوٹیاں سر کیں۔ میری معلومات کے مطابق وہ قریباً 48 برس کی عمر تک ایک سرگرم کوہ پیما رہا۔ تیمور حیدر کی وفات 2003ء کے لگ بھگ ہوئی۔ نیپال میں ایک چوٹی سر کرتے ہوئے تیمور نے اپنی جان شدید خطرے میں ڈالتے ہوئے ایک جاپانی کی جان بچائی اور خود شدید زخمی ہوا۔ دو روز بعد اس نے کھٹمنڈو کے اسپتال میں دم توڑ دیا۔ کوہ پیمائی کی فیلڈ کے لوگ اسے ایک ہیرو کے طور پر یاد کرتے ہیں۔ اسی شیر بچے کا شیر بیٹا۔''

''تیمور حیدر کی بھی تصویر ہے؟'' آنیہ نے بے حد اشتیاق سے پوچھا۔

''بالکل ہے۔'' نہار بولی اور لیپ ٹاپ کی اسکرین پر تیمور کی تین چار تصویریں ابھر آئیں۔ اپنے باپ ہی کی طرح کڑیل۔ آنکھوں میں بے خوفی کی بانکی چمک اور صندوق جیسا سینہ۔ چالیس پینتالیس برس کی عمر تک بھی وہ صحت مند اور مضبوط نظر آتا تھا۔ آنیہ نے بڑی محبت اور عقیدت سے اس جانباز کی یہ تصویریں دیکھیں۔

''اور تیمور حیدر کی اولاد؟'' آنیہ نے پوچھا۔

نہار نے ایک فائل میں کچھ تلاش کرنے کے بعد اسے اسکرین پر انلارج کیا اور بولی۔ ''تیمور حیدر کا ایک بیٹا اور بیٹی تو یورپ میں کہیں سیٹل ہیں۔ دوسرے بیٹے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کہیں راجوری کے علاقے میں

www.pakistanipoint.com

ہے اور کسی اخبار یا چینل وغیرہ سے وابستہ ہے۔ میں کوشش کر رہی ہوں کہ اس کے بارے میں درست جانکاری مل سکے۔ جیسے ہی مجھے کچھ پتا چلا، میں تمہیں انفارم کروں گی۔ ہوسکتا ہے کہ میرے دہلی سے واپس آنے تک کوئی کلیو مل جائے۔''

نہار کور اور آنیہ کے درمیان ہونے والی یہ گفتگو بے حد دلچسپ اور معلومات افزا رہی تھی۔ آنیہ کے لیے تو یہ سب کچھ ایک دفینہ دریافت کرنے جیسا تھا۔ بالآخر اس تصویر سے منسلک لوگ پردۂ اخفا سے باہر نکلے تھے جو سو سال پہلے آنیہ کے جدِ امجد نے جلیانوالا باغ میں اپنے کوڈک کیمرے سے اتاری تھی اور جو اب تک ایک تہ خانے میں رکھے البم میں دبی ہوئی تھی۔

آنیہ نے اپنے اسمارٹ فون پر ایک بار پھر وہ کہنہ تصویر دیکھی۔ زخمی باپ کے اوپر گرے ہوئے دلیر بچے کی آنکھوں میں جھانکا۔ ایک مظلوم کی آنکھیں، جن میں نظر آنے والے غیظ و غضب نے اور مزاحمت کی چمک نے اس تصویر کو بے مثال بنا دیا تھا۔ آنیہ نے تصویر کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے چھوا اور بہ زبانِ خاموشی کہا۔ آخر میں نے آپ کو ڈھونڈ ہی لیا۔

☆☆☆

تصویر والا شیر بچہ اب صرف شیر بچہ نہیں تھا۔ آنیہ کو اس کا نام معلوم ہو چکا تھا۔ اس کے اوراقِ زندگی اس کے سامنے کھل چکے تھے۔ اس کا نام اسد اللہ تھا۔ اس نے ایک انگریز میجر کو قتل کیا تھا اور آزادی کے بعد مشرقی پنجاب کے ہی کسی شہر میں اپنی باقی زندگی گزاری تھی۔ مگر اسد اللہ کی موجود نسل کے بارے میں ابھی تک نہار کور اور آنیہ کو کوئی واضح سراغ نہیں مل سکا تھا۔ دو روز پہلے نہار سے آنیہ کی ٹیلی فونک گفتگو ہوئی تھی۔ اس سے آنیہ کو بس اتنا ہی پتا چل سکا تھا کہ کنچن جنگا میں جاں بحق ہونے والے کوہ پیما تیمور حیدر کی اولاد میں سے ان کا صرف ایک بیٹا یہاں انڈیا میں ہے اور صحافت کے شعبے سے تعلق رکھتا ہے۔ غالب گمان یہی تھا کہ ان دنوں وہ ہماچل سے آگے کہیں ضلع راجوری میں رہائش پذیر ہے اور الیکٹرانک میڈیا کے کسی شعبے سے وابستہ ہے۔

آنیہ ہمیشہ سے فینٹسی پر یقین رکھنے والی لڑکی تھی۔ اب یہ بھی ایک طرح کی فینٹسی ہی تھی کہ وہ اس نسل کے کم از کم کسی ایک فرد سے ضرور ملنا چاہتی تھی، بالمشافہ اس سے بات کرنا چاہتی تھی۔ ایک بھوت سا تھا جو اس کے سر پر سوار ہو چکا تھا۔

ایک دن جیسے بیٹھے بیٹھے کسی نے اس کے کان میں پھونک ماری اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی ماما ٹی وی دیکھ رہی تھیں، چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوگئیں۔

''کیا ہوا آنو؟''

''ماما! میں 'راجوری' جا رہی ہوں، کل صبح۔''

''ہائیں! دیوانی ہوگئی ہے۔ راجوری کیوں جانے لگی تو؟ اور وہاں کیا کام ہے تجھے؟''

''آپ کو بتایا تو تھا کہ ایک آرٹیکل لکھ رہی ہوں، اس کے لیے وہاں جانا ضروری ہے شاید ایک دو دن رکنا بھی پڑے۔''

''آنو...... آنو! کچھ ہوش کے ناخن لے۔ یہ آرٹیکل شارٹیکل والا خناس دماغ سے نکال دے۔ کچھ ڈھنگ کی باتیں سوچ...... اور میں تو تمہیں مشورہ دیتی ہوں کہ اب باقی کی پڑھائی بھی باجی کے گھر جا کر، کر لینا۔ وہ لوگ خود تعلیم کو اہمیت دینے والے ہیں۔ وہاں کوئی رکاوٹ نہیں ہو گی تجھے۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔'' آنیہ کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔ تعلیم کو بہت اہمیت دیتا ہے خالہ کا گھرانا اسی لیے سب بچوں کو تعلیم کے زیور سے لاد رکھا ہے۔''

''آنو! بہت زبان چلانے لگی ہے تو...... یہ نہ ہو کہ میں بھی سخت بولنے پر مجبور ہو جاؤں اور میں صاف بتا دوں...... یہ تمہارا راجوری والا پروگرام بالکل نہیں چلے گا۔ اگر جانا ہی ہے تو پہلے پاپا سے مشورہ کرو اور اگر وہ اجازت دیں تو پھر کسی اور دن کے لیے رکھ لو۔''

وہ اٹھلا کر بولی۔ ''پاپا سے اجازت تو سمجھیں مل ہی گئی ہے...... لیکن...... آپ یہ کیوں کہہ رہی ہیں کہ پروگرام کسی اور دن کا رکھ لو۔''

وہ ٹی وی آف کرتے ہوئے ذرا دھیمی آواز میں بولیں۔ ''کل تیری خالہ مریم کا فون آیا تھا۔ کہہ رہی تھیں کہ انہوں نے آنا ہے۔ تمہارے خالو امجد بھی ساتھ ہوں گے۔''

''کس لیے آنا ہے؟'' آنیہ نے دونوں ہاتھ کمر پر رکھے اور تنک کر بولی۔

''بھئی! تھوڑی بہت بات کرنی ہے انہوں نے تمہارے پاپا سے۔ تمہیں تو پتا ہی ہے کہ باجی مریم بیمار رہتی ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ جلد از جلد فرحان کے سر پر سہرا دیکھ لیں۔ وہ تو اسی سال کی بات کر رہی ہیں لیکن میں نے انہیں سمجھایا ہے کہ ابھی ڈیڑھ دو سال کا وقت تو انہیں نکالنا ہی پڑے گا۔''

وہ ایک دم ہتھے سے اکھڑ گئی۔ ''پلیز ماما! ابھی میرا

www.pakistanipoint.com

شادی کا کوئی ارادہ نہیں۔ ابھی آپ میرے سلسلے میں کسی سے کوئی بات نہ کریں۔ مجھے اپنی تعلیم مکمل کرنے دیں۔ میں نے پاپا سے بھی اس بارے میں بات کی تھی۔ وہ مجھ سے ایگری ہیں......"

"لیکن آنو! یہ بھی تو سوچو کہ......"

"پلیز...... پلیز۔" اس نے تیزی سے کہا اور بات بدل کر بولی۔ "باقی رہی جانے کی بات، وہ تو مجھے کل ہر صورت جانا ہی پڑے گا۔ ورنہ میرا سارا پہلا کام ضائع ہو جائے گا ماما! آپ نے پاپا سے "پرمیشن" کی بات کی ہے تو وہ میں اُن سے لے لوں گی۔"

"کیسے لے لو گی۔" وہ ذرا غصے سے بولیں۔ "اکیلی جانا چاہ رہی ہو ناں؟"

"ابھی تو یہی ارادہ ہے۔ ویسے ہو سکتا ہے کہ میری ایک فرینڈ بھی ساتھ چل پڑے۔ آپ اس پرمیشن والے مسئلے کو مجھ پر چھوڑ دیں۔" اس نے کہا اور اپنے بالوں کو جوڑے کی صورت میں سمیٹتی ہوئی باہر نکل گئی۔

ماما کی بات پر اس کا دماغ کھول کر رہ گیا تھا۔ فرحان کی صورت نگاہوں میں گھوم رہی تھی۔ ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ ماما اس سلسلے میں جتنا زور دیتی تھیں، اس کا دل اتنا ہی اچاٹ ہوتا تھا۔ باقی پاپا سے اجازت لینا کوئی مسئلہ نہیں تھا بلکہ ایک طرح سے وہ اجازت لے ہی چکی تھی۔

اس نے پاپا کو البم کی تصویر کے حوالے سے ہونے والی ساری پیش رفت سے آگاہ کر دیا تھا اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ شاید اسے اس سلسلے میں دو چار دن کے لیے کسی دوسرے شہر جانا پڑے۔ انہوں نے نیم رضامندی ظاہر کر دی تھی۔ اس سے پہلے کہ ماما ان کو فون کر کے قائل کرنے کی کوشش کرتیں۔ آنیہ نے سوچا کہ وہ خود پاپا کو آفس میں فون کر لیتی ہے۔

اسی سہ پہر آنیہ ایک بار پھر امرتسر میں نہار کور کے پاس تھی۔ نہار کور نے ان دنوں لائبریری سے آٹھ دس روز کی چھٹی لی ہوئی تھی۔ لہٰذا دونوں کی ملاقات نہار کور کے گھر واقع رنجیت کالونی میں ہوئی۔ آنیہ نے نہار کو بتایا کہ وہ دو چار دن کے لیے راجوری جانا چاہ رہی ہے۔ وہاں پہنچ کر وہ اسد اللہ حیدر کی موجودہ نسل کے بارے میں معلومات حاصل کرے گی۔ عین ممکن ہے کہ وہ اسد اللہ کے اس پوتے کا کھوج لگانے میں ہی کامیاب ہو جائے جو اطلاعات کے مطابق راجوری ہی کے علاقے میں رہائش پذیر تھا۔

آنیہ کا ارادہ جان کر نہار کی آنکھوں میں بھی ایک تفریحی موڈ دکھائی دینے لگا۔ اس نے کہا۔ "آنیہ جانی، تم راجوری میں رہو گی کہاں؟"

"یوتھ ہاسٹل میں رہ لوں گی...... نہ ہوا تو ہوٹل تو ہیں ہی۔"

"راجوری میں میرے ایک ماموں بھی رہتے ہیں۔ بڑی خوش باش پرسنالٹی ہے، اگر تم چاہو تو اُن کے گھر بھی قیام کر سکتی ہو۔"

آنیہ بولی۔ "میں اکیلی کیسے قیام کر سکتی ہوں یا تو پھر...... تم بھی ساتھ چلو۔ دو چار دن اچھے گزر جائیں گے۔ ویسے بھی ایک اور ایک گیارہ ہوتے ہیں۔"

نہار کور ایک دم سوچ میں پڑ گئی۔

اس کے چہرے پر نیم رضامندی کی جھلک دیکھ کر آنیہ نے فوراً زور دیا۔ "ڈیئر! تم نے چھٹیاں بھی لے رکھی ہیں۔ کیا گھر میں پڑی پڑی بور ہوتی رہو گی۔ دونوں چلتے ہیں۔ بڑا مزہ رہے گا۔ ویسے بھی یہ تمہاری فیلڈ کا کام ہے۔ ہم تصویر والے شیر بچے کی موجودہ نسل کے بارے میں جاننے کی دلچسپ کوشش کر رہے ہیں۔"

پانچ دس منٹ کی گفتگو کے بعد آنیہ کامیاب رہی۔ اس نے نہار کو اپنے ساتھ چلنے پر رضامند کر لیا۔ نہار نے فون پر اسی وقت اپنے ماموں دلبر سنگھ کو اطلاع دے دی کہ وہ اپنی ایک دوست کے ہمراہ کل شام تک ان کے پاس پہنچ رہی ہے۔ انہوں نے بہت خوشی محسوس کی۔

نہار کور کا گھر ایک گنجان آبادی میں تھا۔ (وہ اس گھر میں اپنی بیوہ ماں کے ساتھ رہتی تھی) دونوں اس وقت گھر کی دو منزلہ چھت پر بیٹھی تھیں۔ یہاں سے مشہور جلیانوالا باغ کا فاصلہ ایک ڈیڑھ کلومیٹر سے زیادہ نہیں تھا۔ باغ کی باقیات اور وسیع احاطے کی کچھ جھلکیاں چھت سے بھی دیکھی جا سکتی تھیں۔ مخالف سمت میں کچھ فاصلے پر اس آبادی کے خدوخال دکھائی دیتے تھے جہاں ہونے والا ایک واقعہ اس المناک سانحے کا سبب بنا تھا۔ انگلش مشنری کی ایک انگریز ٹیچر بائیسکل پر ایک گلی سے گزر رہی تھی۔ پورے امرتسر میں فسادات کی آگ بھڑکی ہوئی تھی۔ شروڈ نامی یہ ٹیچر بے خبر تھی کہ وہ بھی اس آگ کی زد میں آنے والی ہے۔ مقامی لوگوں کے ایک مشتعل گروپ نے اس انگلش لیڈی کو بائیسکل سے گرا کر پکڑ لیا اور بُری طرح زدوکوب کیا تھا۔ لیڈی کو نہایت نازک حالت میں اسپتال پہنچایا گیا تھا۔ تشدد کی یہی لہر اس دورانیے میں قریباً 20 ہندوستانیوں اور 5 یورپین کو نگل چکی تھی۔ یہ سارے واقعات جلیانوالا کے قتل عام سے تین روز

www.pakistanipoint.com

پہلے دس اپریل کو ہوئے تھے...... (لیڈی شروڈ کو بعد ازاں بچالیا گیا تھا)
چھت کے اوپر سے ہی نہار کور نے دور اس گلی کی نشاندہی کی جہاں لیڈی شروُڈ والا واقعہ ہوا تھا اور انگریز انتظامیہ نے اہلِ محلہ کو سزا کے طور پر حکم دیا تھا کہ وہ اپنے گھروں میں آنے جانے کے لیے اس گلی میں سے پیٹ کے بل رینگ کر گزریں گے۔
نہار کور کی معلومات اس حوالے سے وسیع تھیں۔ سو سال پہلے کے وہ سارے اندوہناک واقعات پوری جزئیات کے ساتھ آنیہ کی نگاہوں کے سامنے سے گزر گئے۔
پھر دونوں دوست گھر سے نکلیں اور پیدل ہی چلتی ہوئی جلیانوالا باغ کے پیچ و خم میں پہنچ گئیں۔ نہار کور نے ایک گنجان گلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''آنیہ! یہی وہ گلیاں تھیں جہاں سے گزر کر ہزاروں لوگ جلیانوالا باغ کے اندر جمع ہوئے تھے۔ وہ سب نہتے تھے۔ وہ صرف اپنا احتجاج ریکارڈ کرانا چاہتے تھے۔ ان میں جوان ہی نہیں بچے اور بوڑھے بھی شامل تھے۔ وہ سب بے خبر تھے کہ جنرل ڈائر نام کا درندہ ان پر کیا ستم ڈھانے والا ہے۔ نہار کور کی آواز بھرا گئی۔
''اور وہ سامنے والی گلی کے موڑ پر کیا بورڈ لگا ہوا ہے؟'' آنیہ نے پوچھا۔
''یہ وہ گلی تھی جہاں سے جنرل ڈائر مسلح سپاہیوں کے جتھے کے ساتھ باغ کی چار دیواری میں داخل ہوا تھا۔ وہ ہتھیارا تھا اور اس کے سر پر خون سوار تھا۔ تاریخ کے پنّوں پر اس کا نام ہمیشہ کے لیے سیاہ حرفوں میں لکھا جانے والا تھا۔''
وہ دونوں باغ کے اندر داخل ہو گئیں۔ آنیہ یہاں پہلے بھی دو تین بار آ چکی تھی لیکن پتا نہیں کیا بات تھی آج وہ یہاں کے سارے مناظر کو ایک نئے زاویے سے دیکھ رہی تھی۔ دیواروں پر گولیوں کے بے شمار نشانات...... وہ بلند جگہ جہاں سے فائرنگ شروع کی گئی، وہ اندھا کنواں جس میں سیکڑوں خوف زدہ لوگوں نے جانیں بچانے کے لیے چھلانگیں لگائیں اور پھر باغ کے وہ تنگ راستے جہاں سے بیک وقت سیکڑوں لوگوں نے نکلنے کی کوشش کی اور قریباً دس منٹ تک ہونے والی وحشیانہ فائرنگ کا شکار ہوئے۔
باغ کے وسط میں کھڑے کھڑے آنیہ نے نانک چندی اینٹوں کی ایک دیوار پر نگاہیں جمائیں اور سوچا...... شاید یہی وہ جگہ ہوگی جہاں اسد اللہ حیدر نے اپنے زخمی باپ کو اپنے جسم سے ڈھانپا تھا اور پھر اسے مزید نقصان سے بچانے کے لیے مسلح سپاہی پر جھپٹا تھا۔
''نہار! تم نے مجھے اسد اللہ کے زخمی والد تاج محمد کے بارے میں نہیں بتایا، وہ بچ گیا تھا ناں؟''
''بچ تو گیا تھا آنیہ جانی، لیکن زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکا۔ اس کے پیٹ کے اندرونی عضلات بُری طرح گھائل ہو گئے تھے۔ وہ قریباً ڈیڑھ سال زندہ رہا لیکن تقریباً بیماری کی حالت میں ہی رہا۔ اب ذرا سوچو اس سانحے میں مرنے والوں کے جو اعداد و شمار انگریز بتاتے ہیں، وہ کس طرح درست ہو سکتے ہیں۔ قریباً پندرہ سو لوگ گھائل ہوئے تھے۔ ان میں سے کئی ایک مہینوں تک زیرِ علاج رہنے کے بعد اس جہاں سے چلے گئے۔''
آنیہ نے وہیں کھڑے کھڑے تصور ہی تصور میں سو سال پہلے کی المناک آوازیں سنیں۔ فائرنگ کی گونج...... چلّانے کی صدائیں، آہ و بکا، بھگدڑ...... للکارے، مرنے والوں کا غیظ و غضب۔ ایسا نہیں تھا کہ گولیوں کی بوچھاڑ میں وہ سب بھاگتے ہی رہے ہوں گے، ان میں سے کچھ زخم کھا کر پلٹے بھی ہوں گے...... کچھ نے اپنے پیاروں کو خونچکاں ہو کر گرتے دیکھا ہوگا اور بے ساختہ اس جانب بڑھنے کی کوشش کی ہوگی جہاں قاتلوں نے اپنی انگلیاں ٹریگرز پر رکھی ہوئی ہوں گی۔ وہ پہنچ نہیں سکے ہوں گے، وہ بھی راستے میں گر گئے ہوں گے۔ ان کی آنکھوں میں چمکنے والی چنگاریوں کو موت کی سیاہی نے ڈھانپ لیا ہوگا۔
پھر آنیہ کو یوں لگا جیسے سو سال پہلے کا وہ منظر جیتی جاگتی شکل میں اس کی نگاہوں کے سامنے آ گیا ہے۔ اس نے چھوٹی اینٹوں کی دیوار کے پاس اسد اللہ کو زخمی باپ سے لپٹے ہوئے دیکھا۔ وہ ڈرا ہوا تو تھا مگر اس کی آنکھوں میں ایک بجلی چمکتی تھی اور ایک للکارا گونجتا تھا۔ تم ظلم ہو تو میں بغاوت ہوں۔ تم جبر ہو تو میں ایک دیوانی مزاحمت ہوں۔ میں اپنی ہمت طاقت کے مطابق تمہیں روکنے کی کوشش ضرور کروں گا......
نہار نے آنیہ کا کندھا ہلایا تو وہ جیسے اپنے ٹرانس سے باہر آئی...... اور کھوئی کھوئی نگاہوں سے اس سورج کو دیکھنے لگی جو آہستہ آہستہ بلند گھروں کی اوٹ میں اوجھل ہو رہا تھا۔

☆☆☆

اگلے روز آنیہ اور نہار کور جالندھر سے بذریعہ بس راجوری جا رہی تھیں۔ سڑک تھی NH44...... انہیں ہماچل پردیش کے اندر سے ہوتے ہوئے ایک بس بدل کر راجوری

www.pakistanipoint.com

پہنچنا تھا۔ دونوں کے پاس ایک ایک چھوٹا ٹرالی اٹیچی کیس تھا جو بس کے سامان کے خانے میں رکھا تھا۔ مارچ کی وہ پُربہار صبح بڑی چمکیلی اور سہانی تھی۔ ہماچل پردیش کے خوب صورت پہاڑی نظاروں نے آنیہ کو کچھ دیر کے لیے اپنے اندر جذب کرلیا۔ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے وہ جیسے کہیں کھوسی گئی تھی۔ پتا نہیں کیوں اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اس کی زندگی میں کچھ نیا ہونے والا ہے۔ نیا اور انوکھا...... وہ ایک کہانی کو کھوجنے نکلی تھی اور شاید اس کے ساتھ ساتھ کوئی کہانی بھی جنم لے رہی تھی۔

یہ قریباً 370 کلومیٹر کا سفر انہوں نے ساڑھے سات آٹھ گھنٹے میں طے کیا۔ شام چھ بجے کے لگ بھگ وہ راجوری کے خوب صورت و پُرسکون قصبے میں پہنچ گئیں، جسے تھوڑی سی رعایت کے ساتھ شہر بھی کہا جا سکتا تھا۔ سرسبز پہاڑی نشیب وفراز نے اس دلکش بستی کا احاطہ کررکھا تھا...... ایک چمکیلا دریا اس کے مضافات کو چھوتا ہوا گزرتا تھا۔ دریا کے پل کو پار کر کے وہ شہر میں داخل ہوئیں۔ نہار کور کے ماموں دلبر سنگھ انہیں ریسیو کرنے کے لیے بس اسٹینڈ پر ہی موجود تھے۔ وہ ساٹھ کے پیٹے میں تھے۔ جسم فربہ تھا۔ تاہم اچھی صحت اور خوش باش چہرے کے سبب پینتالیس پچاس کے لگ بھگ نظر آتے تھے۔ وہ قدیم اور جدید کا امتزاج تھے۔ سر پر پگڑی اور پہلو میں کرپان تھی، تاہم لباس ٹی شرٹ اور جین پر مشتمل تھا۔ حسبِ توقع انہوں نے تپاک سے دونوں لڑکیوں کا استقبال کیا۔

"جی آیاں نوں، ست بسم اللہ۔ میری پُتریاں آئی ہیں۔" انہوں نے باری باری دونوں کے سر پر ہاتھ پھیرا اور نہار کو گلے سے بھی لگایا۔

ایک درمیانی عمر کا ملازم جو شکل سے مسلمان نظر آتا تھا، ہاتھ باندھے خاموش کھڑا تھا۔ دلبر صاحب نے اسے مخاطب کیا۔ "چل اوئے خیرو، ٹک ٹک کیا دیکھ رہا ہے۔ دھی رانیوں کا سامان پکڑ۔"

خیرو آگے بڑھا مگر دونوں نے منع کر دیا اور خود ہی ٹرالی اٹیچی کیس کھینچتی ہوئی ماموں دلبر سنگھ کے ساتھ آگے بڑھنے لگیں۔

دلبر صاحب نان اسٹاپ باتیں کرتے تھے اور بڑی اچھی باتیں کرتے تھے۔ گھر تک پیدل پہنچنے میں انہیں دس منٹ سے کم ہی لگے مگر اس دوران میں انہوں نے دو تین گھنٹوں کی باتیں کرلیں۔ وہ اس بات پر سخت ناراض تھے کہ وہ دونوں صرف تین چار روز کا پروگرام لے کر کیوں آئی ہیں۔ انہوں نے نہار کو بے تکلفی کے ساتھ گدی سے دبوچتے ہوئے کہا۔ "بچونگڑی، پروہنا آتا اپنی مرضی کے نال ہے پر جاتا میزبان کی مرضی کے نال ہے۔ میں تمہیں اتنی جلدی نہیں جانے دوں گا۔"

نہار نے کہا۔ "ماما جی! آنیہ کی ماں بڑی سخت ہیں، وہ تین روز سے زیادہ کی اجازت نہیں دیں گی۔"

وہ چھاتی پر ہاتھ مار کر بولے۔ "میں اس کی ماں سے زیادہ سخت ہوں اور جو پیار والی سختی ہوتی ہے ناں یہ بڑوں بڑوں کو رام کر دیتی ہے۔ میں بہن جی سے فون پر بات کروں گا۔"

نہار کور کے ماموں کا دومنزلہ گھر ایک صاف ستھری بارونق آبادی میں تھا۔ چار پانچ کمرے نیچے، تین چار اوپر تھے۔ کشادہ گیراج بھی تھا جس میں نیلے رنگ کی سوزوکی کار کھڑی تھی۔ دس سال پہلے اپنی پتنی کے گزرنے کے بعد سے دلبر صاحب یہاں اکیلے ہی رہتے تھے۔ بس پرانا ملازم خیروان کے ساتھ تھا۔ نہار نے بتایا تھا کہ ماموں کچھ عرصہ انڈین آرمی میں بھی رہے ہیں مگر پھر آرمی چھوڑ دی اور امرتسر سے یہاں آکر آباد ہو گئے۔ ایک بڑا پلاٹ ان کے پاس تھا۔ اس پلاٹ پر انہوں نے ایک چھوٹی سی مارکیٹ بنالی، اس مارکیٹ کے کرائے سے ان کی گزر بسر بہ آسانی ہو رہی تھی۔

ڈنر زبردست تھا اور چائنیز تھا۔ نہار نے ذرا حیران ہو کر کہا۔ "ماما جی! یہ کیا؟ آپ نے چائنیز منگوا لیا۔ آپ تو دیسی کے دیوانے ہیں۔ کڑاہی گوشت، چانپیں، بھاجی پلاؤ وغیرہ؟"

"دھی رانی، آج کل ذرا ڈائٹنگ کر رہا ہوں۔ چائنیز کے دو فائدے ہیں۔ تم خوش ہو کر کھاؤ گی، تے میں کم کھاؤں گا۔"

بہرحال عملاً ایسا نہیں ہوا۔ کم کھاتے کھاتے بھی دلبر ماموں کافی کچھ سمیٹ گئے۔ آنیہ سوچنے لگی۔ اگر یہ ڈائٹنگ پر نہ ہوتے تو کیا ہوتا۔

کھانے کے بعد گفتگو کا دور ہوا۔ دلبر ماموں نے خیرو سے کہا۔ "یار! تم کیا پھٹے پرانے جھنڈے کی طرح کھڑے لہرا رہے ہو، ہم باپ بیٹیوں کو ذرا گل بات کرنے دو۔"

وہ مسکراتا ہوا رخصت ہو گیا۔ مالک اور ملازم ہونے کے باوجود دونوں میں ایک طرح کی بے تکلفی تھی۔ اچنبھے کی بات یہ بھی تھی کہ خیرو مسلمان تھا۔

دلبر ماموں نے کہا۔ "اب ذرا کھل کر بتاؤ کہ دھی

www.pakistanipoint.com

رانیاں صرف سیر سپاٹے کے لیے آئی ہیں یا فیر کوئی مشن وغیرہ بھی ہے؟''

نہار نے مسکرا کر کہا۔ ''بس، ماماں جی! چھوٹا سا مشن بھی ہے۔''

''کسی منڈے کو قتل شتل تو نہیں کرنا؟'' وہ شوخ لہجے میں بولے۔

نہار پھر زور سے ہنسی، آنیہ نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ ''نہیں ماما جی، قتل تو نہیں کرنا کسی کو...... لیکن ...... بہت عرصہ پہلے قتل ہونے والے کسی بے گناہ کی آل اولاد کا کھوج ضرور لگانا ہے۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے نہار سنجیدہ ہوگئی۔

''کیا سچی مچی کوئی قتل ہوا ہے؟'' نہار نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''کب کی بات ہے؟'' دلبر ماموں نے پوچھا۔

''سو سال پہلے کی...... پورے سو سال۔'' نہار نے 2019ء کے کیلنڈر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں سمجھا نہیں پتری۔''

آنیہ نے طویل سانس لی اور گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''ہم جلیانوالا کی بات کر رہے ہیں انکل جی! جلیانوالا اور امرتسر......''

دلبر ماموں کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔ وہ بھی ایک دم سنجیدہ نظر آنے لگے۔ انہوں نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''وہاں اک قتل تو نہیں ہوا تھا دھی رانیو، سیکڑوں ہوئے تھے اور دیکھو، ہوئے بھی کس موقع پر تھے...... بے ساکھی کے موقع پر...... میری ماتا کہا کرتی تھی، تمہارے اک دور کے رشتے دار بھی جلیانوالا میں شہید ہوئے تھے، گھر سے بے ساکھی منانے نکلے اور لاش بن کر آگئے۔''

جلیانوالا کا ذکر شروع ہوا تو طویل ہوتا چلا گیا۔ نہار کور اور آنیہ نے دلبر ماموں کو اپنے یہاں آنے کا مقصد بتایا۔ وہ تصویر بھی دکھائی جس کا عنوان ''شیر بچہ'' تھا اور جس کے مستقبل کا سراغ لگاتے لگاتے وہ دونوں یہاں آ پہنچی تھیں۔

آخر میں نہار نے کہا۔ ''ماما جی! تیمور حیدر ایک کوہ پیما تھے۔ وہ 2003ء میں ایک جاپانی کی جان بچاتے ہوئے مارے گئے تھے۔ ان کا ایک بیٹا یہیں کہیں راجوری ڈسٹرکٹ میں ہے، کسی اخبار یا نیوز چینل کے لیے کام کرتا ہے۔ جہاں تک میری جانکاری ہے اس کا نام شہاب حیدر یا شہباز حیدر ہے۔ ہم اسی کو کھوجنا چاہتے ہیں۔ اس کے کھوج سے ہی ہمارا آرٹیکل مکمل ہوگا۔''

دلبر ماموں خوش ہوئے کہ ان دونوں کی اس کاوش کے ڈانڈے جلیانوالا باغ کے تاریخی واقعے سے جا کر ملتے ہیں۔ انہوں نے دونوں کو ہر طرح کے تعاون کا یقین دلایا۔

☆☆☆

دوسرے روز دلبر ماموں کو ایک تاریخ پر جانا تھا۔ انہوں نے اپنی نیلی سوزوکی گاڑی نہار کور اور آنیہ کے حوالے کر دی۔ اس کے علاوہ ملازم خیرو کو بھی ان کے ساتھ کر دیا۔ وہ تینوں سب سے پہلے ائرپورٹ کے قریب ایک لوکل ہندی اخبار کے دفتر پہنچے اور اپنے مطلوب کے بارے میں جاننے کی کوشش کی۔ کچھ خاص پتا نہیں چلا۔ اس کے بعد انہوں نے گاڑی کا رخ ایک بڑے چینل کے زونل آفس کی طرف کر دیا۔ یہاں تھوڑی سی پیش رفت ہوئی۔ انہیں پتا چلا کہ مطلوبہ نوجوان کا اصل نام شہباز حیدر ہے تاہم اسے صحافتی حلقوں میں شہابی حیدر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ شہابی حیدر نے کچھ عرصے تک اس چینل میں بھی کام کیا تھا لیکن اب چھوڑ چکا تھا۔ یہاں آنیہ اور نہار نے شہابی حیدر کی ایک دو تصویریں بھی دیکھ لیں۔ آنیہ اور نہار کو لگا کہ انہوں نے ''شیر بچے'' کے پوتے کے بارے میں جیسا سوچا تھا، ویسا ہی پایا ہے۔ دراز قد، چوڑے شانے، روشن پیشانی، مردانگی اس کے پورے سراپا میں رچی بسی نظر آتی تھی۔ وہ کہیں آتشزدگی کے مقام پر مائیک تھامے کھڑا تھا اور اس کی آنکھوں میں شعلوں کی سرخی منعکس ہو رہی تھی۔

اگلا روز بڑا کارگر ثابت ہوا۔ صبح سویرے ہی انہیں پتا چل گیا کہ معروف کوہ پیما تیمور حیدر کا بیٹا اور ''شیر بچے'' کا پوتا، شہابی حیدر دہلی کے ایک انگلش نیوز چینل سے وابستہ ہے اور راجوری ڈسٹرکٹ میں چینل کی نمائندگی کرتا ہے۔ وہ آج کل یہاں سینئر فیلڈ رپورٹر کے طور پر بھی کام کر رہا تھا۔ دوپہر تک اس کی رہائش کا ایڈریس بھی آنیہ اور نہار کو معلوم ہوگیا۔

آنیہ بے حد ''ایکسائٹڈ'' تھی۔ بالآخر وہ شیر بچے (اسد اللہ) کی موجودہ نسل کا کھوج لگانے میں کامیاب رہی تھی۔ اب وہ اس نسل کے ایک فرد سے ملنے جا رہی تھی۔

دوپہر کے تھوڑی دیر بعد آنیہ اور نہار دلبر ماموں کی سوزوکی کار میں سوار نجی بادشاہ زیارت کے قریب شہابی حیدر کی رہائش گاہ پر پہنچ گئیں۔ شہابی حیدر سے ملاقات کے حوالے سے ان کا ایک پروگرام تھا لیکن جب وہ موقع پر پہنچیں تو ساری پلاننگ دھری رہ گئی۔ وہاں پہلے سے ایک ہنگامہ برپا تھا۔ ایک بڑی کوٹھی جس کی پیشانی پر ''زباب منزل'' کی تختی لگی ہوئی تھی، ان کے سامنے تھی۔ کوٹھی کے

www.pakistanipoint.com

سامنے درجنوں لوگ جمع تھے۔ بہت سے راہ گیر بھی وہاں رک گئے تھے۔ کوئی زوردار جھگڑا چل رہا تھا۔ نہار اور آنیہ نے کار کچھ فاصلے پر کھڑی کی اور پیدل ہی چل کر موقع پر پہنچیں۔ انہوں نے شہابی حیدر کو پہچان لیا۔ اس کا گریبان پھٹا ہوا تھا اور چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ اس نے ایک ادھیڑ عمر، مسکین صورت عورت کو کندھوں سے تھام رکھا تھا۔ وہ گرجا۔ ”میں کہتا ہوں اماں جی! آپ اندر چلیں، میں دیکھ لوں گا اِن کو...... اندر چلیں آپ۔“

وہ دبلی پتلی ادھیڑ عمر عورت کو کھینچتا ہوا کوٹھی کے گیٹ کے پاس لے آیا۔ اس کے ایک دو مددگار، ادھیڑ عمر عورت کو اندر لے گئے۔ اسی دوران میں بڑی توند والا ایک شخص آگے بڑھا اور کڑک کر بولا۔ ”شہابی! یہ تو اچھا نہیں کر رہا۔ ہم تمہیں اس طرح نہیں کرنے دیں گے۔ چھوکری اور چھوکرے کو باہر نکال، نہیں تو ابھی تماشا لگ جائے گا۔ میں پورا جلوس لے کر آجاؤں گا۔“

شہابی دہاڑا۔ ”تو لے کر آ جلوس...... میں دیکھ لوں گا تجھے اور تیرے چمچوں کڑچھوں کو بھی۔“

”حرامزادے...... مورکھ...... تیری ساری پھنّے خانی اور ”اینکری“ تیری ناک کے راستے نہ نکال دی تو ٹھیکیدار نام نہیں میرا۔“

گالی پر شہابی اور مشتعل ہوا۔ وہ خطرناک انداز میں توند والے ٹھیکیدار کی طرف بڑھا۔ ٹھیکیدار کا ایک ہٹّا کٹّا ساتھی شہابی کے راستے میں آیا۔ شہابی نے بے دریغ اس کے چہرے پر مُکّا رسید کیا۔ وہ الٹ کر دوسرے لوگوں پر جا گرا۔ ”سؤر کے بچے...... باسٹرڈ! تیری گندی زبان کھینچ لوں گا۔“ شہابی پھر توند والے نیم گنجے شخص پر دہاڑا اور اس کی طرف لپکا۔ شہابی کے دو تین ساتھیوں نے شہابی کو بانہوں میں جکڑ لیا۔ وہ ان کی گرفت سے نکل نکل جا رہا تھا۔ دوسری طرف فربہ اندام ”ٹھیکیدار“ بھی چلّا رہا تھا۔ اس کا ایک دبلا پتلا ساتھی اسے مخاطب کر کے بولا۔ ”ٹھیکیدار جی! اس خبیث کے منہ لگنے کی ضرورت نہیں۔ پولیس کو بلائیں۔“

”ہاں، ہاں بلاؤ۔ ابھی بلاؤ بلکہ میں خود فون کرتا ہوں۔ تمہاری بدمعاشی اب عدالت کے کٹہرے میں جائے گی۔“ شہابی گرجا۔

دونوں طرف کے کئی افراد بیچ میں پڑ گئے اور معاملے کو مزید بگڑنے سے بچانے کی کوشش کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد ٹھیکیدار اور اس کے ساتھی قدرے ٹھنڈے نظر آئے۔ وہ دھمکیاں دیتے ہوئے اپنی گاڑیوں میں بیٹھے اور وہاں سے نکل گئے۔

آنیہ اور نہار کور نے بہتر سمجھا کہ اب وہ واپس ہی چلی جائیں۔ شہابی حیدر سے ملاقات شام کو یا پھر کل کسی وقت بھی کی جا سکتی تھی مگر جب وہ اپنی گاڑی کی طرف آئیں تو گاڑی کے پیچھے کوئی اور بندہ اپنی کار پارک کر گیا تھا۔ انہوں نے دو چار منٹ انتظار کیا پھر اپنی کار کا ہارن دینے لگیں۔ کوئی نمودار نہیں ہوا۔ شہابی اور اس کے تین چار ساتھی اب بھی کوٹھی کے گیٹ کے سامنے موجود تھے۔ وہ دونوں لڑکیوں کو پریشان دیکھ کر ان کی طرف چلے آئے۔

نہار نے شہابی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”کوئی یہ کار پارک کر گیا ہے جی یہاں۔“

”بڑے بے پروا لوگ ہوتے ہیں۔ گاڑیاں مل جاتی ہیں مگر سڑک پر چلنے کے طور طریقے نہیں آتے۔“ شہابی حیدر نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

”شیر بچے“ کے پوتے کی آواز سن کر اور اسے اتنا قریب پا کر آنیہ کی دھڑکنیں زیر و زبر ہو رہی تھیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے جھگڑے کا جو سین ملاحظہ کیا تھا، وہ بھی عین حسبِ حال تھا اور شہابی حیدر کی جرأت مندی اور طور اطوار کی عکاسی کرتا تھا۔

شہابی نے ساتھیوں سے کہا کہ وہ آس پاس کار کے مالک کو دیکھیں...... بڑھی ہوئی شیو اور لمبے بالوں والے ایک نوجوان نے کہا۔ ”او چھوڑو جی! گاڑی کو اٹھا کر ایک طرف کر دیتے ہیں بلکہ سڑک کے درمیان رکھ دیتے ہیں۔“

دو تین اور لڑکوں نے ہاں میں ہاں ملائی، اس سے پہلے کہ وہ ایسی کوئی کوشش کرتے، آنیہ نے ہمت کی اور دو قدم چل کر شہابی کے پاس آئی۔ ”آپ شہابی حیدر ہی ہیں ناں؟“ اس نے پوچھا۔

”بالکل ہوں، فرمائیں؟“

وہ ذرا توقف سے بولی۔ ”دراصل...... ہم آپ ہی سے ملنے آئے تھے...... ہم ایک آرٹیکل لکھ رہے ہیں تحریکِ آزادی اور جلیانوالا باغ کے حوالے سے...... آپ سے بھی کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔ بڑی مشکل سے آپ کا پتا ملا تھا لیکن اس وقت چونکہ...... یہاں اور طرح کی صورتِ حال بنی ہوئی ہے اس لیے سوچا کہ پھر حاضر ہو جائیں گے۔“

شہابی حیدر چند سیکنڈ چپ رہا۔ اس کی کشادہ پیشانی پر سوچ کی لکیریں ابھر آئی تھیں۔ وہ بولا۔ ”اب آپ آ ہی گئی ہیں، تو پھر آ جائیے، اس طرح دروازے سے واپس جانا تو ٹھیک نہیں۔“

www.pakistanipoint.com

آنیہ اور نہار نے ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

پانچ منٹ بعد وہ دونوں شہابی حیدر کے ساتھ گھر کے سجے سجائے کشادہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھیں۔ یہاں ایک شوکیس میں چند ایک ایوارڈز رکھے تھے اور دیواروں پر کچھ ایسی فریم شدہ تصویریں نظر آ رہی تھیں جن سے پتا چلتا تھا کہ شہابی حیدر صحافت کے میدان میں کافی سرگرم ہے۔ چند تصویریں کوہ پیمائی کے حوالے سے بھی تھیں۔ ان میں فلک بوس چوٹیاں نظر آتی تھیں، ان تصویروں کا تعلق یقیناً شہابی حیدر کے مرحوم والد تیمور حیدر سے تھا۔

بڑھی ہوئی شیو اور لمبے بالوں والا نوجوان بھی یہاں ڈرائنگ روم میں موجود تھا مگر پھر اس نے شہابی سے اجازت چاہی اور کسی کام سے باہر نکل گیا۔ ایک ملازمہ کولڈ ڈرنک لے آئی۔ آنیہ جیسے کہیں کھوسی گئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ جاگتی آنکھوں کے ساتھ ایک خواب دیکھ رہی ہے۔ اسداللہ (شیر بچے) کی تصویر کو وجود میں آئے پورے سو سال ہو چکے تھے اور اب اس کا پوتا اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ یقیناً یہ اس کا پوتا ہی تھا۔

شہابی کو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ وہ دونوں جالندھر سے آٹھ گھنٹے کا سفر کر کے یہاں پہنچی ہیں۔ رسمی گفتگو کے بعد وہ دونوں اصل اور حقیقی موضوع پر آ گئیں۔ نہار نے لرزتے ہاتھوں سے اسمارٹ فون کی اسکرین پر شہابی حیدر کو وہ فوٹوگراف دکھائی جو اُن کے یہاں پہنچنے کا سبب بنی تھی۔

شہابی حیدر نے تصویر کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو شاید جلیانوالا باغ کے واقعے کی ہے۔''

آنیہ نے کہا۔ ''بے شک یہ وہیں کی ہے...... لیکن اس تصویر میں جو دو چہرے نظر آ رہے ہیں، ان کو شاید آپ نہیں جانتے۔''

شہابی حیدر نے نفی میں سر ہلایا اور ایک بار پھر توجہ سے آنیہ اور نہار کور کو دیکھنے لگا۔ ان دونوں نے بھی سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ تب نہار نے لمبی سانس لی اور ٹھہرے لہجے میں بولی۔ ''شہابی صاحب! شاید آپ کو یہ سن کر بہت حیرانی ہو کہ اس تصویر میں جو کم سن چہرہ نظر آ رہا ہے، وہ آپ کے دادا محترم کا چہرہ ہے، اسداللہ حیدر......''

شہابی نے ان دونوں پر غیر یقینی نگاہ ڈالی اور تب دوبارہ دھیان سے تصویر کو دیکھنے لگا۔

نہار نے کہا۔ ''اور یہ جو زمین پر زخمی پڑے ہیں، یہ آپ کے پڑدادا ہیں۔''

شہابی حیدر کے چہرے پر بے پناہ حیرت نظر آنے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ لرزاں آواز میں بولا۔ ''آپ یہ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ یہ ان دونوں کی تصویر ہی ہے؟''

نہار کور نے کہا۔ ''آپ کو پتا ہے ناں کہ آپ کے پڑدادا جلیانوالا میں زخمی ہوئے تھے اور شاید یہ بھی پتا ہو گا کہ آپ کے دادا اسداللہ نے، جو اس وقت دس سال کے تھے، برستی گولیوں میں انہیں بچانے کی کوشش کی تھی۔''

''وہ سب...... ٹھیک ہے...... لیکن یہ تصویر...... مجھے یقین نہیں آ رہا۔''

شہابی حیدر کو پوری طرح یقین کرنے اور سمجھنے میں دس پندرہ منٹ لگ گئے۔ تصویر کا پورا سیاق و سباق جاننے کے بعد وہ بھی بے حد جذباتی نظر آنے لگا۔ آنیہ نے اُسے تفصیل سے بتایا کہ یہ تصویر کیسے اتاری گئی، اب تک کہاں تھی؟ اور کیسے اس تک پہنچی، وغیرہ وغیرہ۔ (آنیہ اور نہار نے اس کلیو کی نشاندہی بھی کی جس نے ان کی تلاش کو آگے بڑھایا تھا۔ یعنی زخمی باپ کے جسم پر نظر آنے والی فوجی قمیص) تصویر کے ساتھ موجود تحریر نے بھی شہابی کو بہت متاثر کیا۔

اس نے تصویر اور تحریر کو اپنے فون میں منتقل کیا۔ پھر جذباتی انداز میں اٹھا اور بولا۔ ''ایکسکیوز می میں ابھی آیا۔''

وہ ڈرائنگ روم سے نکل کر اندرونی دروازے میں اوجھل ہو گیا۔ اس کی واپسی قریباً پانچ منٹ بعد ہوئی۔ اس مرتبہ شہابی حیدر کے ساتھ دو خواتین بھی تھیں۔ دونوں ادھیڑ عمر تھیں۔ ان میں سے ایک بارعب خدوخال اور امیرانہ لباس سے گھر کی مالکن لگتی تھیں۔ پتا چلا کہ وہ شہابی حیدر کی والدہ زباب بیگم ہیں۔ گھر کی پیشانی پر موجود ''زباب منزل'' انہی کے نام سے منسوب تھی۔ دوسری خاتون عام شکل و صورت کی تھیں۔ لباس بھی نسبتاً کم قیمت تھا۔ بہرحال رکھ رکھاؤ ان میں بھی نظر آ رہا تھا۔ گھر کی مالکن بڑے تپاک سے ملیں۔ اس سو سال پرانی تصویر نے انہیں بھی بہت حیران کیا تھا۔ وہ آنیہ اور نہار کے قریب ہی بیٹھ گئیں۔ بڑی توجہ سے تصویر کو دیکھتے ہوئے بولیں۔ ''اگر یہ واقعی میرے شوہر کے محترم والد کی تصویر ہے تو ہم سب کے لیے بے حد اہم ہے۔''

سادہ لباس والی دوسری خاتون بھی اشتیاق سے تصویر پر نگاہیں جمائے ہوئے تھیں۔ وہ اپنی مالکن کے پہلو میں کھڑی تھیں، بولیں۔ ''میرا دل کہہ رہا ہے کہ یہ تیمور صاحب کے والد اسداللہ صاحب کی ہی تصویر ہے۔ آپ نے بھی تو ان کے لڑکپن کی تصویریں دیکھی ہوئی ہیں۔ یہ وہی

www.pakistanipoint.com

ہیں۔‘‘

زباب بیگم نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔’’یہ تو ایک بڑی دریافت ہوگئی ہمارے لیے..... کیوں شہابی؟‘‘ انہوں نے بیٹے کی طرف دیکھا۔

شہابی کی کشادہ پیشانی پر بالوں کی لٹیں تھیں اور وہ بھی جیسے کھوسا گیا تھا۔

’’امی! یہ تصویر کے نیچے والی تحریر بھی پڑھیں۔‘‘ وہ بولا۔

ماں، بیٹا سر جوڑ کر فون کی اسکرین سے تحریر پڑھنے لگے۔ ان کے عقب میں کھڑی دوسری خاتون بھی موٹے شیشوں کی عینک کے پیچھے سے پڑھنے کی کوشش کررہی تھیں۔ مالکن کی طرح ان کی عمر بھی ساٹھ کے لگ بھگ تھی، ان کو شہابی، آپا خالہ کہہ کر پکار رہا تھا۔

اس فیملی کے لیے یہ سب کچھ بہت دلچسپ اور سنسنی خیز ثابت ہوا تھا۔ زباب بیگم نے بھی آنیہ اور نہار سے اس ساری تگ و دو کے سلسلے میں سنا جو ان دونوں نے اس تصویر کے ساتھ یہاں تک پہنچنے کے لیے کی تھی۔ شہابی حیدر بھی آرام سے بیٹھا یہ گفتگو سنتا رہا۔ تھوڑی دیر پہلے کوٹھی سے باہر ٹھیک ٹھاک جھگڑا ہوا تھا، تاہم اس جھگڑے کے سبب کسی طرح کا تناؤ یا تفکر شہابی کے چہرے پر نظر نہیں آتا تھا۔

کچھ دیر بعد شہابی کے موبائل فون پر ایک کال آگئی۔ اس کے چہرے پر سرخی جھلکی اور وہ کشادہ ڈرائنگ روم کے ایک گوشے میں جا کر فون پر بات کرنے لگا۔ آنیہ اور نہار کو اندازہ ہوا کہ یہ گفتگو اسی جھگڑے کے سلسلے میں ہے۔

نہار نے ذرا جھجکتے ہوئے زباب بیگم سے پوچھا۔ ’’آنٹی جان! یہاں کوئی جھگڑا ہوا ہے؟‘‘

انہوں نے ایک گہری سانس لی۔’’جھگڑا تو کسی وجہ سے ہوتا ہے۔ یہ سراسر بدمعاشی ہے جو یہ لوگ کررہے ہیں، جب لڑکا لڑکی بالغ ہیں، راضی ہیں تو پھر یہ لوگ کون ہوتے ہیں انہیں ایک دوسرے سے دور کرنے والے، یہ پکی بات ہے۔ ان خبیثوں کا ارادہ ان دونوں کو مارنے کا ہے۔‘‘

’’ہاں جی، باہر کچھ باتیں تو ہم نے بھی سنی ہیں۔ وہ لوگ کسی لڑکی کو باہر نکالنے کا کہہ رہے ہیں۔‘‘

’’لڑکی ہے اور اس کا شوہر بھی ہے، دونوں نے اپنی مرضی سے کورٹ میں نکاح کیا ہے، دونوں مسلمان ہیں۔ لڑکی کا باپ پکا مسلمان کہلاتا ہے مگر جس طرح کی باتیں کررہا ہے، وہ اسلام میں کہیں نہیں ہیں۔ ہمیں پکا پتا ہے، صلح کے بہانے یہ لوگ لڑکی لڑکے کو یہاں سے لے جائیں گے اور ان کے ساتھ کچھ بُرا کر گزریں گے۔‘‘

’’یہ بڑی توند والا ٹھیکیدار کون ہے۔ وہ بہت بڑھ چڑھ کر باتیں کررہا تھا؟‘‘ آنیہ نے دریافت کیا۔

لڑکی کا باپ سلیم احمد اسی کے پاس فورمین کے طور پر کام کرتا ہے۔ بلکہ ٹھیکیدار کا سارا کام اسی نے سنبھالا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ٹھیکیدار اس طرح بڑھ چڑھ کر سلیم کی حمایت کررہا ہے لیکن اب یہ سب کچھ بیٹے شہابی کے علم میں آگیا ہے۔ وہ اس طرح ان کی سینہ زوری نہیں چلنے دے گا۔‘‘ زباب بیگم نے ہال کمرے کے گوشے میں کھڑے شہابی حیدر کی طرف دیکھا جو ابھی تک فون پر گفتگو کرنے میں مصروف تھا۔

زباب بیگم نے نہار کور اور آنیہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔’’آؤ، میں تمہیں دکھاؤں ان دونوں بچوں کو۔ بالکل سیدھے سادے ہیں، کیا زندہ رہنا ان کا حق نہیں ہے۔‘‘

زباب بیگم نہار اور آنیہ کو لے کر ایک قالین پوش راہداری سے گزریں اور پھر ایک کشادہ کمرے میں پہنچیں۔ آپا خالہ بھی ان کے پیچھے پیچھے آرہی تھیں۔ کمرے میں ایک لڑکا اور لڑکی ڈرے سہمے پرندوں کی طرح بیٹھے تھے۔ لڑکا بمشکل بیس سال کا ہوگا۔ لڑکی کی عمر اٹھارہ کے لگ بھگ دکھائی دیتی تھی۔ لڑکی کے گورے چٹے ہاتھوں پر مہندی کا رنگ اس بات کی گواہی دیتا تھا کہ اس کے نکاح کو ایک دو ہفتے ہی ہوئے ہیں۔ معصومیت اس کے چہرے سے ٹپکی پڑتی تھی۔ لڑکا ذرا ہوشیار دکھائی دیتا تھا تاہم اس کے چہرے پر بھی سچائی کی چمک تھی۔ کمرے کے ایک گوشے میں وہی سوکھی سڑی غریب صورت عورت جائے نماز بچھائے سسک رہی تھی۔ جسے تھوڑی دیر پہلے آنیہ اور نہار نے باہر جھگڑے کے دوران میں دیکھا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ ’’لڑکے ظہیر‘‘ کی بیوہ والدہ ہے اور دونوں بچوں کے انجام سے سہمی ہوئی ہے۔

زباب بیگم نے اُسے گلے سے لگا کر تسلی دی اور کہا۔ ’’فکر نہ کرو بہن، سب ٹھیک ہوجائے گا۔‘‘

دبلی پتلی عورت نے روتے ہوئے کہا۔’’بیگم جی، شہابی بیٹے سے کہیں کہ ہمیں اپنی اس چار دیواری سے نہ نکالے۔ یہ لوگ چیر پھاڑ کھائیں گے ہم کو۔‘‘

زباب بیگم بولیں۔’’کہا ہے ناں، وہ نہیں نکالے گا اور اگر ضروری بھی ہوا تو اس سے زیادہ محفوظ جگہ پر رکھے گا تمہیں۔ وہ ابھی علاقے کے ڈی ایس پی سے بات کررہا

تھا۔ وہ اس کے جاننے والوں میں سے ہے۔ ویسے بھی کورٹ میرج کے پیپر تمہارے پاس ہیں، قانون تمہاری طرف ہے، ان لوگوں کی طرف نہیں۔“

معصوم صورت لڑکی کا نام نادیہ اور لڑکے کا ظہیر تھا۔ زباب بیگم کو دیکھ کر نادیہ بھی سسکنا شروع ہوگئی تھی۔ زباب بیگم نے اس کے سر پر بھی ہاتھ پھیرا اور پھر آنیہ اور نہار کے ساتھ واپس ڈرائنگ روم میں آگئی۔

شہابی اب بڑے مطمئن انداز میں صوفے پر بیٹھا ایک میگزین کی ورق گردانی کررہا تھا۔ اس نے والدہ کو بتایا کہ ڈی ایس پی اور مقامی ایم پی اے راجا انوار سے اس کی بات ہوگئی ہے۔ جب تک یہ معاملہ پوری طرح سیٹل نہیں ہو جاتا، لڑکا، لڑکی اور لڑکے کی والدہ ایم پی اے راجا انوار کی تحویل میں رہیں گے اور پوری تسلی تشفی ہونے کے بعد ہی انہیں کہیں اور بھیجا جائے گا۔

زباب بیگم کے چہرے سے بھی اضطراب اور تناؤ کی کیفیت کم ہوگئی۔ گفتگو کا موضوع ایک بار پھر وہی نادر تصویر بن گئی۔ زباب بیگم نے اپنے مرحوم شوہر تیمور حیدر کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ بھی اکثر جلیانوالا باغ کا اور وہاں ہونے والے سنگین واقعات کا ذکر کیا کرتے تھے۔ 1988ء میں جب تیمور نے پہلی بار ”نانگا پربت“ سر کی تھی تو چنڈی گڑھ میں ان کے لیے ایک استقبالیہ تقریب منعقد ہوئی تھی۔ ان کے والد مرحوم (اسداللہ حیدر) کی قبر بھی وہیں پر ہے۔ ہم ان کی قبر پر بھی گئے تھے۔ قبرستان میں ہی نیم کے ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ کر تیمور نے جلیانوالا باغ کا سارا واقعہ دہرایا تھا اور بتایا تھا کہ اس اندوہناک واقعے نے ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں کس طرح نئی روحِ پھونکی تھی...... اور اس قتلِ عام کے بعد کس طرح برصغیر میں جابر انگریزوں کے دن گنے گئے تھے۔

زباب بیگم نے معروف مسلمان قانون دان سیف الدین کچلو کا ذکر بھی کیا جن کی گرفتاری کے بعد مسلمانوں میں بھی انگریزوں کے خلاف اشتعال میں زبردست اضافہ ہوا اور انہوں نے اپریل 1919ء میں جلیانوالا کے مزاحمتی اجتماع میں بھرپور شرکت کی۔

یہ گفتگو ختم ہوئی تو زباب بیگم نے محبت بھری نظروں سے آنیہ اور نہار کور کی طرف دیکھا اور بیٹے شہابی حیدر سے مخاطب ہوکر بولیں۔ ”بھئی، یہ اتنی دور سے چل کر ہمیں ملنے آئی ہیں، ان کو ذرا راجوری میں گھماؤ پھراؤ۔“

شہابی نے میگزین ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ ”تو کہاں جانا پسند کریں گی آپ؟“

نہار ایک دم بول اٹھی۔ ”یہ دنیدھر فورٹ کہاں ہے۔ اس کے بارے میں کافی سنا ہے۔“

”زیادہ دور نہیں، آپ کہتی ہیں تو کل چلے چلیں گے۔ یہاں سے بمشکل پندرہ منٹ کی ڈرائیو ہوگی، آپ کے گھر سے تیس چالیس منٹ کی۔ موسم اچھا ہی ہے۔ صبح کے وقت بھی جاسکتے ہیں۔“

وہیں بیٹھے بیٹھے اگلے روز فورٹ اور سائیں گنجی بادشاہ زیارت دیکھنے کا پروگرام بن گیا۔ زباب بیگم نے آنیہ اور نہار سے وعدہ لیا کہ وہ کل ڈنر ان کے ساتھ کریں گی اور نہار اپنے ماماجی دلبر سنگھ کو بھی ضرور ساتھ لائے گی۔

☆☆☆

موسم ذرا ابر آلود تھا۔ مزیدار ہوا چل رہی تھی۔ شہابی اپنی ہلمین گاڑی پر آیا تھا۔ نہار اور آنیہ اس کے ہمراہ آدھ پون گھنٹے میں DHANIDHAR FORT (دنیدھر فورٹ) پہنچ گئیں۔ کل والا وہ نوجوان بھی شہابی کے ساتھ ہی تھا جس کے بال لمبے تھے اور شیو بڑھی ہوئی تھی۔ اس کا نام ان دونوں کو راسو معلوم ہوا تھا۔ شہابی حیدر اسے بے تکلفی سے راسو کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ اس کی موجودگی آنیہ اور نہار کو کچھ زیادہ اچھی نہیں لگی لیکن وہ چپ بیٹھی رہیں۔ آنیہ اور نہار گاڑی کی پچھلی نشست پر تھیں۔ وہ دونوں اگلی نشستوں پر تھے۔ فورٹ پر پہنچ کر وہ گاڑی سے اترے تو آنیہ نے کچھ سکھ کا سانس لیا۔ اسے راسو کے جسم سے اور لباس سے سگریٹ نوشی کی بُو آتی رہی تھی۔

دنیدھر قلعے کا منظر شاندار تھا۔ یہ آثارِ قدیمہ کا ایک دلکش نمونہ تھا۔ ٹوٹی پھوٹی دیواروں، محرابوں اور شکستہ چبوتروں میں بھی ایک طرح کی خوب صورتی تھی۔ نہار کور اس میں خاص دلچسپی محسوس کررہی تھی۔ شہابی کسی گائیڈ کی طرح نہار کو مسلسل معلومات فراہم کررہا تھا۔ ”یہ انیسویں صدی کے وسط میں تعمیر ہوا تھا۔ یہاں ڈوگرے، اناج اور دیگر سامانِ رسد بھی جمع کرتے رہے ہیں۔ دراصل راجوری کے پرانے گورنر نے......“ شہابی بول رہا تھا مگر آنیہ کو اس کی باتوں میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہ بس اس کے لہجے کے اتار چڑھاؤ کو سن رہی تھی۔ اس کے تاثرات کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے چلنے کا انداز، اپنے ہاتھوں کو حرکت دینے کا اسٹائل۔ وہ ایک نامعلوم سی کشش محسوس کرنے لگی تھی اس کی طرف۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اس شخص کو بہت پہلے سے جانتی ہے۔ اس کی ہر ادا سے واقف ہے۔ یہ شاید ”شیر بچے“ کی

www.pakistanipoint.com

جرنلسٹ تک آن پہنچی تھی۔ شہابی سے کل دوپہر جو پہلا تعارف ہوا تھا، وہ بھی اس انسیت اور عقیدت کو بڑھانے کا سبب بنا تھا۔ چوڑے شانوں اور آنکھوں میں بے خوف چمک رکھنے والا یہ شخص ویسا ہی تھا جیسا اس نے تصور کیا تھا۔

وہ شہابی حیدر کو دیکھ رہی تھی جب اچانک چونک گئی۔ اس کی نگاہ شہابی حیدر کے دوست راسو پر پڑی۔ راسو کی نگاہیں اسے تاڑ رہی تھیں۔ وہ ایک دم جھینپ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی اسے یہ بے ترتیب سا بندہ کچھ اور بھی ناپسندیدہ محسوس ہوا۔ کہنے کو وہ شہابی کا دوست تھا مگر دونوں کی بول چال، حلیے اور طبیعت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ شہابی حیدر جتنا نفیس اور خوش لباس تھا، وہ اتنا ہی اجڈ اور خستہ حال نظر آتا تھا۔ اب بھی وہ دونوں لڑکیوں کی پروا کیے بغیر مسلسل سگریٹ نوشی کر رہا تھا۔ وہ کم بولتا تھا مگر اس کی نگاہوں میں ایک تیزی سی تھی جو چبھتی محسوس ہوتی تھی۔

وہ چاروں قریباً ایک گھنٹے تک فورٹ میں گھومتے رہے۔ یہاں سیاحوں کی اور ٹولیاں بھی موجود تھیں۔ آنیہ ذرا تھکن محسوس کرنے لگی مگر نہار تو دیوانی سی ہو رہی تھی۔ وہ جیسے اس فورٹ کے ہر ایک گوشے کو اپنے کیمرے میں قید کر لینا چاہتی تھی، بادل گہرے ہو رہے تھے۔ لہٰذا انہوں نے سوچا کہ جلدی یہاں سے نکل جائیں۔ وہ سب جوس وغیرہ پینے کے لیے ایک سائبان کے نیچے بیٹھے تو نہار پھر کیمرا لے کر فورٹ کے پیچ وخم میں گم ہو گئی۔ وہ پانچ منٹ میں آنے کا کہہ گئی تھی مگر اسے واپسی میں دیر ہو گئی۔ ”آپ بولتی ہی کم ہیں یا ہم سے زیادہ بات کرنا اچھا نہیں لگ رہا۔“ شہابی نے آنیہ کو بے تکلفی سے مخاطب کرتے ہوئے کہا تو اس کے سارے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔

”نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔ دراصل نہار زیادہ بولتی ہے اس لیے آپ کو لگ رہا ہے کہ میں کم بولتی ہوں۔“ اس نے بمشکل کہا۔

اس سے پہلے کہ شہابی حیدر کوئی جواب دیتا، ایک تیز کڑک کے ساتھ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ دوپہر کے وقت ہی گہری شام کا منظر دکھائی دینے لگا تھا۔ بوچھاڑیں ان کے پاؤں بھگونے لگیں۔

”میرا خیال ہے اس شیڈ میں تو ہم بھیگ جائیں گے۔“ شہابی حیدر نے کہا۔

”اور لگتا ہے کہ بارش مزید تیز ہو گی۔“ راسم عرف راسو نے اپنی بھاری بھرکم آواز میں کہا۔

وہ تینوں شیڈ کے نیچے سے نکلے اور بھاگتے ہوئے ایک کوٹھری نما جگہ پر گھس گئے۔ یہ کوٹھری جیسی جگہ قلعے کی بیرونی فصیل کے قریب ہی تھی۔ یہاں وہ تیز بوچھاڑوں سے محفوظ ہو گئے تاہم ان کے کپڑے جزوی طور پر گیلے ہو گئے تھے۔ شہابی حیدر کے دوست راسو کی نگاہیں ایک بار پھر آنیہ پر تھیں۔ اس نے چادر کو اپنے جسم پر درست کیا اور ایک کونے میں کھڑی ہو گئی۔ بارش کی شدت بڑھتی جا رہی تھی۔ سیاحوں کی چار پانچ اور ٹولیاں بھی قلعے کے اندر ہی مختلف پناہ گاہوں میں گھس گئی تھیں۔

”لگتا ہے کہ یہ جلدی تھمنے والی نہیں ہے۔“ شہابی حیدر نے اپنے ہاتھ ملتے ہوئے، گرجتے برستے آسمان کی طرف دیکھا۔

”پتا نہیں وہ کہاں رہ گئی ہے؟“ آنیہ مضطرب ہو کر بولی۔ ”پھر شولڈر بیگ سے اپنا موبائل فون نکالا۔

”ٹھہریں، میں کرتا ہوں۔“ شہابی حیدر بولا اور نہار سے کال ملائی۔

رابطہ ہو گیا۔ وہ قلعے کی عقبی طرف ایک پنجابی فیملی کے ساتھ ایک کشادہ شیڈ تلے پناہ لیے ہوئے تھی، آنیہ اور شہابی کو تسلی ہوئی۔

شہابی نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی فرینڈ کو تو ہسٹری اور آثار قدیمہ میں بہت دلچسپی ہے، آپ کا شغل کیا ہے؟“

شہابی کے بے تکلفانہ انداز گفتگو نے آنیہ کو کچھ حوصلہ بخشا۔ وہ بولی۔ ”نہار کیمرے کی آنکھ سے دیکھ کر تصویر بناتی ہے، میں اپنی آنکھ سے دیکھ کر بناتی ہوں۔“

”یعنی پینٹنگ۔“ وہ خوش ہو کر بولا۔ آنیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”فنونِ لطیفہ والے لوگ تو مجھے بھی بڑے پسند ہیں۔ آپ نے ہمارے ڈرائنگ روم میں کوہ ہمالیہ کے سلسلے کی کچھ پینٹنگز بھی دیکھی ہوں گی۔ آپ کو پتا ہے وہ کس نے بنائیں؟“

”آپ کے مرحوم والد تیمور حیدر صاحب نے؟“

”نہیں، وہ تو صرف پہاڑوں پر چڑھتے تھے۔ یہ تصویریں والدہ زباب بیگم نے بنائی ہیں۔ جوانی میں اور شادی کے بعد بھی انہیں پینٹنگ کا شوق رہا ہے۔ کئی سفروں میں وہ والد کے ساتھ بھی رہیں۔ وہ اپنا کام کرتے رہے، یہ اپنا کام کرتی رہیں۔ جس سفر میں وہ جاپانی کوہ پیما کو بچاتے ہوئے شہید ہوئے اس سفر میں بھی وہ ان کے ساتھ تھیں اور بیس کیمپ میں موجود تھیں۔“

”دلیری آپ کے خون میں ہمیشہ سے شامل رہی

www.pakistanipoint.com

ہے۔'' وہ جیسے بے ساختہ کہہ گئی اور پھر کچھ جھینپ بھی گئی۔

''یہ تو آپ کی ذرہ نوازی ہے۔ ویسے وہ پہلے لوگوں جیسا جذبہ اور حق کے لیے مر مٹنے کا عزم ہمارے نصیب میں کہاں؟ یہاں تو قدم قدم پر مصلحت اور مفاہمت کے کڑوے گھونٹ پینے پڑتے ہیں۔'' پھر وہ ایک دم موضوع بدل کر بولا۔ ''ویسے اگر آپ واقعی اچھی پینٹر ہیں تو پھر آپ کے لیے میرا ایک بڑا قیمتی مشورہ ہے۔'' وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔ پھر چند قدم دور کھڑے راسو کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''لیکن میں یہ مشورہ راسو کے سامنے آپ کو نہیں دوں گا، ورنہ یہ پتا نہیں کتنوں کو بتا کر اس کی ساری اہمیت اور سارا مزہ ختم کر دے گا۔''

''تمہاری بے اعتباری کبھی ختم نہیں ہو گی۔ بہتر ہے کہ مجھے ساتھ ہی نہ لایا کرو۔'' راسو نے بھاری لہجے میں کہا اور بے تکلفی سے شہابی کو مُکا دکھایا۔

اس دوران میں پتا نہیں کہاں سے ایک چھتری تیز ہوا میں اُڑتی ہوئی ان تک پہنچ گئی۔ شہابی حیدر نے جلدی سے اسے لپک لیا۔ چھتری کے پیچھے کوئی نہیں آیا۔ شہابی حیدر نے کہا۔ ''اسے کہتے ہیں نعمت غیر مترقبہ۔''

کافی کشادہ چھتری تھی۔ دو چار منٹ بعد بارش کا زور تھوڑا سا کم ہو گیا۔ ہوا کی رفتار بھی ماند پڑ گئی مگر کالے سیاہ بادل آسمان پر جمے کھڑے تھے۔ شہابی حیدر کے دوست راسو نے کہا۔ ''چھتری تو آگئی ہے اگر کہیں تو ان کی فرینڈ کو لے آؤں۔''

''ہاں، یہ بہتر رہے گا۔ وہاں پریشان ہو رہی ہوں گی۔'' شہابی نے کہا۔

وہ مزید کچھ کہے بغیر چھتری لے کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

اب اس نیم تاریک کوٹھری میں آنیہ اور شہابی تنہا تھے۔ آنیہ کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ وہ کوئی کمزور لڑکی نہیں تھی، نہ ہی اس کے کردار پر کسی بھی طرح انگلی اٹھائی جا سکتی تھی۔ وہ صنفِ مخالف سے بہت لیے دیے رہتی تھی مگر پتا نہیں کیوں یہاں اس کا سارا دم خم ایک دم ناپید ہو گیا تھا۔

خاموشی بوجھل ہونے لگی تو وہ بولی۔ ''شہابی! آپ کے یہ دوست آپ سے کچھ مختلف نظر آتے ہیں۔''

وہ مسکرایا۔ ''یہ صرف دوست ہی نہیں، ایک طرح سے گھر کا فرد بھی ہے۔ ہم دونوں اکٹھے کھیل کود کر جوان ہوئے ہیں۔ گھر میں آپا خالہ کو دیکھا تھا ناں آپ نے؟ روسو ان کا ہی بیٹا ہے۔ ذرا بے پروا سا ہے لیکن دل کا بُرا نہیں ہے۔ آپا خالہ بھی جوانی میں ہی ہمارے پاس آگئی تھیں۔ وہ زباب منزل کی سب سے پرانی ملازمہ ہیں۔ بلکہ وہ فیملی کا حصہ ہی ہیں۔ انہوں نے ہمیں گود میں کھلایا ہے۔ راسو اُن کی واحد اولاد ہے۔''

''یہ کرتے کیا ہیں؟ میرا مطلب ہے راسو صاحب؟''

''محترمہ کسی شاعر نے کہا ہے ناں کہ جو کچھ نہیں کرتے وہ کمال کرتے ہیں لیکن خیر راسو بالکل بھی بیکار نہیں ہے، یہ ایک اچھے معیار کا اسنوکر کلب چلاتا ہے۔ اپنی گزر بسر کر لیتا ہے۔''

''اور آپ اس الیکٹرانک میڈیا کی طرف کیسے آگئے؟'' آنیہ نے ایک لمحے کے لیے اس سے نظریں ملا کر پوچھا۔

''کیوں؟ نہیں آنا چاہیے تھا؟'' اس نے الٹا سوال کیا۔

''میرا مطلب ہے آپ کے دادا اسد اللہ فوج میں تھے، آپ کے والد تیمور حیدر نے کوہ پیمائی جیسی سخت کوش فیلڈ اختیار کی۔''

''تو آپ کا کیا مطلب ہے یہ صحافت، کوہ پیمائی سے کچھ کم ہے؟ نہیں محترمہ! یہ زیادہ مشکل ہے اور سچائی کا ساتھ دینے والوں کے لیے تو اور زیادہ مشکل۔''

شہابی حیدر کے فقرے نے آنیہ کو متاثر کیا، وہ ستائشی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ بولا۔ ''اور آپ فرمائیں...... آپ دیکھنے میں تو سچائی کو بڑی سنجیدگی سے لینے والی کوئی سائنس اسٹوڈنٹ لگتی ہیں، آپ مصوری کی طرف کیسے آگئیں؟''

''آپ کو بتایا ہے ناں کہ کمپیوٹر سائنس تو میں پڑھ رہی ہوں، مصوری بس شوق تھا جو دھیرے دھیرے بڑھتا گیا ہے۔''

''اچھا، آپ لینڈ اسکیپ بناتی ہیں یا پورٹریٹ وغیرہ؟''

''لینڈ اسکیپ...... لیکن کبھی کوئی خاص موقع ہو تو پورٹریٹ اور کیلی گرافی وغیرہ بھی کر لیتی ہوں۔''

''یہ تو پھر بڑی اچھی بات ہے، میں ابھی کچھ دیر پہلے آپ سے اسی سلسلے میں بات کرنے لگا تھا یہاں راجوری میں لینڈ اسکیپ پینٹنگز کا ایک بڑا مقابلہ ہونے والا ہے، کافی بڑی انعامی رقم ہے۔ حصہ لینے والوں کو خاصی پروجیکشن بھی ملے گی۔ ابھی باقاعدہ اناؤنسمنٹ نہیں ہوئی

www.pakistanipoint.com

ہے لیکن میڈیا سے تعلق رکھنے کے سبب میرے پاس اس حوالے سے ایڈوانس انفارمیشن موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اس مقابلے میں حصہ لے سکتی ہیں...... آپ کے پاس اپنے کام کا کوئی نمونہ وغرہ ہے، میرا مطلب ہے آپ کے موبائل فون میں؟''

شہابی حیدر کا اندازہ درست تھا۔ آنیہ کے اسمارٹ فون مین اپنی پینٹنگز کے کچھ عکس موجود تھے۔ شہابی حیدر کے کہنے پر آنیہ نے اسے وہ فوٹوگراف دکھائے۔ اس نے غور سے دیکھے اور متاثر ہوا۔ دبے دبے جوش سے بولا۔ ''میرا تو مشورہ ہے مس آنیہ! آپ اس ''کمپی ٹیشن'' میں ضرور حصہ لیں۔ موضوع آثارِ قدیمہ ہے۔ میں اس کے لیے آپ کو بڑی اچھی لوکیشن سجیسٹ کرسکتا ہوں۔''

وہ سوالیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔

اس نے ڈرامائی انداز میں سامنے دیکھا۔ موسلا دھار بارش کی اوٹ سے دنیدھر فورٹ کے خوب صورت نشیب و فراز اور پیچ وخم نظر آرہے تھے۔ وہ بولا۔ ''اگر آپ مقابلے میں حصہ لینا چاہیں تو آپ کے پاس کافی وقت ہے۔ آپ اس فورٹ کے کچھ دلکش حصے کینوس پر اتار سکتی ہیں۔''

یکا یک ہوا کا رخ بدلا۔ بارش کی تیز بوچھاڑیں اس کوٹھری کے اندر تک آنے لگیں۔ آنیہ گھبرا کر بائیں جانب ہٹی تو اونچی ایڑی کے سبب لڑکھڑا گئی۔ شہابی نے اسے بروقت کندھوں سے تھام لیا۔ اپنے کندھوں پر اس کی مضبوط گرفت محسوس کر کے وہ جیسے سرتاپا لرز گئی اور جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔ ''دسس سوری۔'' وہ گھبراہٹ میں بس اتنا ہی کہہ سکی۔

وہ محویت سے اُس کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ اس کی نگاہوں کی تپش آنیہ نے اپنے نم سراپا پر محسوس کی۔ قلعے کی بلند و بالا فصیل کی برجیوں پر بجلی چمکی اور پھر بادل دہاڑنے لگے۔ آنیہ کو اب گھبراہٹ سی محسوس ہورہی تھی۔ وہ رسٹ واچ دیکھ کر بولی۔ ''آپ کا دوست ابھی تک نہیں لوٹا۔''

''شاید وہ بارش کے ہلکا ہونے کا انتظار کررہے ہوں گے۔''

''کچھ دیر پہلے ہلکی تو ہوگئی تھی۔'' آنیہ نے کہا۔

''لیکن پھر تیز ہوگئی۔ آپ گھبرائیں نہیں۔ وہ ابھی پہنچ جاتے ہیں۔'' اس نے شائستگی سے کہا۔

آنیہ کے ذہن میں خواہ مخواہ ہی وسوسے سر اٹھا رہے تھے۔ غالباً اس کی وجہ یہی تھی کہ شہابی حیدر کا دوست اس کے ذہن میں کوئی اچھا تاثر قائم نہیں کرسکا تھا۔

اس کو پریشان دیکھ کر ہی شاید شہابی نے اپنا موبائل فون نکال لیا مگر اسی دوران میں آنیہ کے فون پر نہار کور کی کال آگئی۔ اس نے بتایا کہ وہ پنجابی فیملی کے ساتھ گپ شپ کررہی ہے۔ جونہی بارش ہلکی ہوتی ہے، وہ دونوں پہنچ جاتے ہیں۔

بارش ہلکی ہونے میں دس پندرہ منٹ مزید لگ گئے۔ اس دوران میں آنیہ اور شہابی حیدر آپس میں باتیں کرتے رہے۔ ایک دوسرے کی فیملیز کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتے رہے۔ آنیہ تو پہلے ہی بہت کچھ جانتی تھی، زیادہ سوالات شہابی کررہا تھا۔ پتا نہیں کیوں آنیہ کو لگ رہا تھا کہ وہ غیر محسوس طور پر شہابی حیدر کی طرف کھنچتی چلی جارہی ہے۔ اسے محسوس ہورہا تھا جیسے جلیانوالا کے باغ والا دلیر اور مزاحم اسد اللہ حیدر ایک نئے روپ میں اس کے سامنے ہے۔

کچھ ہی دیر بعد نہار کور اور راسم عرف راسو کی واپسی بھی ہوگئی۔ اب سہ پہر، شام کی طرف سرکنا شروع ہوگئی تھی۔ انہوں نے سائیں کنجی بادشاہ کی زیارت کا پروگرام کل پر ڈال دیا اور باقی کا وقت یہیں فورٹ میں گزارنے کا فیصلہ کیا۔

پروگرام کے مطابق نہار کے ماماجی کو بھی ڈنر کے وقت زباب منزل پہنچ جانا تھا۔ آنیہ، نہار، شہابی حیدر اور راسو، گھوم پھر کر آٹھ بجے کے لگ بھگ زباب منزل پہنچے تو وہاں ماموں دلبر سنگھ صاحب پہلے سے موجود تھے اور زباب بیگم و آپا خالہ کے ساتھ دھواں دھار گفتگو فرمارہے تھے۔ ان کو بھی کورٹ میرج کرنے والے لڑکے لڑکی کی کہانی کا پتا چل چکا تھا۔ ان کی ساری ہمدردیاں شادی شدہ جوڑے کے ساتھ تھیں۔ انہوں نے چھوٹتے ساتھ ہی شہابی کا کندھا تھپکا اور کہا۔ ''پتر جی! خوش رہو، حق سچ کا ساتھ دینے سے رب سوہنا راضی ہوندا ہے۔ لڑکا لڑکی بالغ ہیں، سیانے ہیں، اپنی مرضی سے اِک ہوئے ہیں تو یہ ٹھیکیدار کون ہوندا ہے ان کو نکھیڑنے والا۔ کارروائی تو ان لوگوں کے خلاف ہونی چاہیے۔''

''انشاء اللہ سب اچھا ہوجائے گا انکل۔'' شہابی نے بڑے اعتماد سے کہا۔

''پتّر جی! اب کہاں ہیں وہ دونوں؟'' دلبر صاحب نے پوچھا۔

شہابی کے بجائے زباب بیگم نے بتایا۔ ''ان کی والدہ اور ان دونوں کو ابھی تھوڑی دیر پہلے ایم پی اے

www.pakistanipoint.com

صاحب کی رہائش پر پہنچا دیا گیا ہے۔''

''جب تک معاملہ پوری طرح سیٹل نہیں ہو جاتا وہ تینوں وہاں رہیں گے۔'' شہابی حیدر نے وضاحت کی۔ دلبر صاحب نے ایک بار پھر شہابی کا کندھا تھپکا اور بولے کہ انہوں نے اس کے بارے میں جیسا سنا تھا، ویسا ہی پایا ہے۔

زباب بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''سردار صاحب، آپ کے لیے پرہیزی کھانا بنوایا ہے۔ نہار بیٹی بتا رہی تھی کہ آج کل آپ ''ڈائٹنگ'' پر ہیں۔''

''اوہو...... بہن جی...... آپ نے خواہ مخواہ تکلف کیتا ہے۔ ان دونوں دھی رانیوں کی وجہ سے ڈائٹنگ کو فی الحال میں نے گڈبائے کہہ دتا ہے۔''

''کیا مطلب ماما جی؟'' نہار کور نے حیران ہو کر کہا۔

''بھئی، ڈائٹنگ نہ چھوڑتا تو پھر تمہاری مہمان نوازی نہیں ہو سکدی تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ گھر میں چنگا کھانا پکا ہو تو پھر مجھ سے رہا نہیں جاسکدا۔''

کھانے کے دوران میں بھی ایک دو مرتبہ آنیہ اور شہابی میں نگاہوں کا تبادلہ ہوا۔ جب بھی ایسا ہوا آنیہ کو اپنے جسم میں سنسنی کی لہریں محسوس ہوئیں۔ ایک مرتبہ اسے لگا جیسے نہار کور بھی کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔

کھانے کے بعد کچھ دیر تک گپ شپ کا دور چلا۔ آپا خالہ بھی اس گفتگو میں شریک رہیں۔ ان کا نام رابعہ معلوم ہوا۔ وہ بڑے دھیمے اور شائستہ لہجے میں بات کرنے والی خاتون تھیں۔ زباب بیگم کو وہ ''باجی'' کہہ کر بلاتی تھیں۔ آنیہ کو عجیب لگا کہ ''آپا خالہ رابعہ'' جیسی دھیمے مزاج کی عورت کا بیٹا راسو جیسا ہے۔ راسم عرف راسو کھانے میں شریک نہیں ہوا تھا۔ پتا چلا کہ وہ اپنے اسنوکر کلب کے دوستوں کے ساتھ کسی پارٹی میں گیا ہوا ہے۔

دلبر صاحب نے بڑے خلوص اور محبت کے ساتھ شہابی اور اس کے اہلِ خانہ کو اپنے گھر کھانے کی دعوت دی اور بتایا کہ ان کا مسلمان ملازم خیرو بڑے مزیدار دیسی اور پنجابی کھانے بناتا ہے۔ جلیانوالا باغ کے تذکرے نے جیسے ان دونوں گھرانوں میں ایک قربت سی پیدا کر دی تھی۔

وقتِ رخصت جب وہ لوگ باہر اپنی گاڑی تک آئے تو گراسی لان کی کیاریوں کے قریب آنیہ کی نگاہ ایک بار پھر ایک دراز قد، سفید پوش لڑکی پر پڑی۔ وہ گارڈن لائٹ کی روشنی میں باغیچے کی ایک پتھریلی روش پر خاموش بیٹھی تھی۔ بالکل گم صم اور کھوئی ہوئی۔ اس کے لمبے شہد رنگ بال ایک چوٹی کی صورت اس کے سینے پر کنڈلی مارے بیٹھے تھے۔

اس جواں سال لڑکی کو آنیہ اور نہار نے پہلے روز بھی یہاں زباب منزل میں دیکھا تھا۔ اس وقت بھی وہ سفید لباس میں تھی اور کھوئے کھوئے سے انداز میں پودوں کو پانی دے رہی تھی۔ اس کی ایک ٹانگ درست نہیں تھی اور وہ بُری طرح لنگڑا کر چلتی تھی۔ اب کی بار آنیہ سے رہا نہیں گیا۔ اس نے لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے زباب بیگم سے پوچھا۔ ''آنٹی جان! یہ کون ہیں؟''

زباب بیگم کے سرخ و سپید چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا۔ پھر سنبھل کر بولیں۔ ''یہ راسو کے ایک دوست کی بیوہ ہے۔ اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں، یہاں ہمارے پاس ہی رہتی ہے۔''

اندازہ ہوا کہ وہ اس لڑکی کے بارے میں بس اتنا ہی بتانا چاہتی ہیں۔ شہابی حیدر نے بھی اس بارے میں کوئی بات نہیں کی۔

☆☆☆

ماموں دلبر سنگھ کے گھر میں آنیہ اور نہار نے ایک رات اور گزاری۔ رات کے کھانے کے بعد دلبر ماموں کا ایک دوست آ گیا۔ وہ بھی ان ہی کی طرح جولی تھا۔ وہ اس کے ساتھ ڈی وی ڈی پر ایک پنجابی ڈراما دیکھنے میں مصروف ہو گئے۔ یہ پاکستانی اسٹیج ڈراما تھا جس میں پاکستانی اسٹیج اسٹارز امان اللہ اور سہیل احمد وغیرہ نے کام کیا تھا۔ آنیہ کو معلوم ہوا کہ نہار کے دلبر ماموں پاکستانی ڈراموں اور خاص طور سے اسٹیج ڈراموں کے زبردست شوقین ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ انڈیا کے بڑے بڑے کامیڈین پاکستانی کامیڈینز کے سامنے پانی بھرتے نظر آتے ہیں۔

آج سہ پہر نہار کور دنیدھر فورٹ سے جو درجنوں تصویریں اتار کر لائی تھی، ان میں ایک تصویر پتھر کے ایک ٹوٹے ہوئے کتبے کی بھی تھی۔ کتبے پر کچھ لکھا تھا مگر تحریر پتا نہیں کیا تھی، یہ ہندی تھی، نہ سنسکرت، نہ کوئی اور علاقائی زبان۔ آنیہ کے پلے کچھ نہیں پڑا۔ مگر نہار نے تھوڑی سی کوشش کے بعد اور گوگل سے کچھ معلومات لینے کے بعد تحریر پڑھ لی۔ اس نے مزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ شاید ڈیڑھ پونے دو سو برس پہلے کا کتبہ ہے۔ کسی ڈوگرا رئیس زادے یا شہزادے نے اپنی محبوبہ وجنتی کے لیے لکھا ہے...... پیاری یہ وہ جگہ ہے، جہاں ہم تم راجا صاحب کے جانے کے بعد پہلی مرتبہ ملے تھے اور ہمارے پریم کو زبان ملی تھی۔''

نیچے شاید ہندی کا ایک شعر بھی کندہ ہے مگر وہ حصہ

www.pakistanipoint.com

ٹوٹ چکا ہے۔ صرف چاند اور گگن وغیرہ کے الفاظ ہی نظر آتے ہیں۔'' یہ الفاظ تو تمہاری سمجھ میں بھی آرہے ہوں گے۔''

آنیہ نے حیرت سے کہا۔''یار! تم نے یہ کیسے پڑھ لیا۔''

''آنیہ جانی! تمہاری یہ خاکسار دوست ہسٹری کی اسٹوڈنٹ ہی نہیں ہے، پرانی زبانوں کی بھی ماہر ہے۔ باقاعدہ کورس کر رکھا ہے میں نے...... لندن کی یونیورسٹی SOAS کی خاک چھان کر آئی ہوئی ہوں۔ کیا سمجھیں؟''

آنیہ نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔''پتا نہیں، یہ وجنتی کون ہوگی؟ ان لوگوں کے پریم کا انجام کیا ہوا ہوگا؟''

نہار کور مسکرا کر بولی۔''اس کا تو پتا نہیں...... لیکن ایک بات ضرور ثابت ہوتی ہے۔ یہ فورٹ ہمیشہ سے ہے رومان پرور...... اور اس رومانیت نے میری آنیہ جانی پر بھی کچھ نہ کچھ اثر کیا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' آنیہ چونک کر بولی۔

''تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں جناب۔'' نہار کور نے آنکھیں نچائیں۔

''یہ کیا فضول بکواس ہے۔'' آنیہ کا رنگ ایک دم گلابی ہوگیا۔

نہار زور سے ہنسی۔''اس کو کہتے ہیں چور کی داڑھی میں...... نہیں...... چورنی کے بالوں میں تنکا۔ آنیہ جانی میں نے تو صرف رومانیت کا تذکرہ کیا ہے۔ آثارِ قدیمہ میں بھی تو ایک طرح کی رومانیت ہوتی ہے۔ اس میں صنف مخالف وغیرہ کا ہونا ضروری تو نہیں۔''

آنیہ ابھی تک غصے میں نظر آرہی تھی۔ چہرے پر ایک شرمگیں سا تاثر بھی موجود تھا۔ نہار سنجیدہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولی۔''ویسے آنیہ! مذاق کی بات تو رہی ایک طرف۔ شہابی حیدر ''پرسنالٹی'' زبردست ہے۔ ویسا ہی سج دھج اور آن بان والا جیسا کہ تم نے ایک تصور قائم کیا تھا اور مجھے شما کرنا، سچی بات کہوں گی۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ بھی تم سے کچھ نہ کچھ متاثر ہے۔''

آنیہ کچھ دیر تک نہار کی طرف دیکھتی رہی پھر ایک دم پنجے نکال کر اس پر جا پڑی۔ دونوں بستر پر گریں۔''نہار کی بچی...... شیطان کی ٹولی...... میں تیری طبیعت ٹھیک کروں گی۔'' آنیہ نے اس کے پیٹ میں زوردار چٹکی کاٹتے ہوئے کہا۔

''ہائے ربا، مار دیا۔'' نہار نے دبی دبی کراہ کے ساتھ کہا اور آنیہ کو جوابی چٹکی کاٹنے کی ناکام کوشش کی۔

''شرم نہیں آتی، اس طرح کی باتیں کرتے ہوئے۔'' آنیہ مصنوعی غصے کے انداز میں پھنکار کر بولی اور اس کی انگلیاں مروڑیں۔

''آتی ہے...... آتی ہے...... رب دی قسم، آتی ہے۔'' نہار نے اس کے نیچے سے نکلنے کے لیے زور لگایا۔ سائڈ ٹیبل پر رکھا ہوا شیشے کا ایک گلاس ٹوٹ گیا۔ قریبی کمرے سے ماموں دلبر سنگھ کی آواز آئی۔''او کیا ہوگیا ہے بھئی، خیر تو ہے؟''

وہ دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ ہوئیں اور اچھل کر کھڑی ہوگئیں۔ چاپ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ماموں اسی طرف آرہے ہیں۔

دونوں نے جلدی جلدی اپنے لباس درست کیے۔ نہار نے اپنی ٹی شرٹ کی ادھڑی ہوئی آستین لپیٹی۔ اسی اثنا میں ماموں دلبر اندر آگئے۔ انہوں نے ذرا حیرت سے کمرے کا منظر دیکھا۔''کیا ہوا دھی رانیو؟''

''کک...... کچھ نہیں ماما جی...... چھ...... چھپکلی اندر آگئی تھی، اسے مارنے کی کوشش کر رہی تھیں۔'' نہار نے بہانہ بنایا۔

''بھئی کوئی خاص قسم کی چھپکلی ہوگی، گھس بیٹھیوں جیسی۔ ورنہ اِدھر تو کبھی چھپکلی کا کوئی دور کا رشتے دار بھی نظر نہیں آیا۔'' انہوں نے گہری نظروں سے آنیہ اور نہار کا جائزہ لیا پھر دبی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔''بلکہ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ شاید اک نہیں دو چھپکلیاں تھیں، جو آپس میں لڑ رہی تھیں۔'' وہ واپس چلے گئے۔ دونوں طویل سانس لے کر بستر پر بیٹھ گئیں۔ آنیہ اپنے لمبے بال سمیٹنے لگی۔

☆☆☆

دوسرے روز انہوں نے شہابی حیدر کے ساتھ پھر راجوری کی تفریحی جگہوں کا ایک ٹور لگایا۔ وہ گنجی بادشاہ زیارت گئے، دریا کا نظارہ کیا، پھر ایک شاندار وزارت دیکھا۔ شروع میں تو شہابی کا دوست راسم عرف راسوان کے ساتھ نہیں تھا مگر جب وہ ''اسٹیڈیم'' کی طرف جارہے تھے وہ بھی اپنی ہیوی موٹر بائیک پر آیا اور ان کے ساتھ شامل ہوگیا۔ اس کی طرح اس کی بائیک بھی خستہ حال ہی تھی۔ پتا نہیں کیوں اس کی موجودگی آنیہ کو بے چین سی کر دیتی تھی۔ ویسے وہ کچھ زیادہ بولتا نہیں تھا مگر اس کے دیکھنے کا انداز اور کبھی کبھی گھورنے کا انداز آنیہ کو اچھا نہیں لگتا تھا۔

باتوں کے دوران میں وہ آنیہ سے مخاطب ہوا اور

www.pakistanipoint.com

ہنس کر بولا۔ ''کل تو آپ بہت پریشان ہوگئی تھیں۔ شاید آپ نے یہ سوچا ہوگا کہ میں نے آپ کی دوست کو اغوا کرلیا ہے۔''

نہار چمک کر بولی۔ ''آپ جمع خاطر رکھیے۔ میں اتنی جلدی اغوا ہونے والی نہیں ہوں۔''

''اغوا ہونے سے پہلے سب ایسے ہی کہتے ہیں۔'' اس نے تُرت جواب دیا۔

شہابی نے کہا۔ ''اچھا بکواس بند کرو، یہ مہمان ہیں اپنی۔ لہٰذا تہذیب کا دائرہ۔''

وہ مسکرایا اور منہ پھیر کر سگریٹ کے کش لینے لگا۔

یہ دن بھی کافی خوشگوار گزرا۔ سیر سپاٹے کے دوران میں آنیہ اور نہار اپنے میزبان شہابی حیدر سے مختلف سوالات بھی پوچھتی رہیں۔ ان سوالات کا تعلق شہابی کے والد تیمور حیدر اور دادا اسداللہ (شیر بچہ) کے حوالے سے ہی تھا۔ دکھانے کے لیے آنیہ اپنی ڈائری میں ''آرٹیکل'' کے لیے کچھ نوٹس وغیرہ بھی لیتی رہی۔ شہابی حیدر کی زندگی میں جھانکنا، معاشرے اور موجودہ اقدار کے حوالے سے اس کی بے باک گفتگو سننا، اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا پینا، یہ سب کچھ آنیہ کو بہت بھلا لگ رہا تھا۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے ایک تفریحی پارک کے مین گیٹ پر انہوں نے ایک دوسرے کو الوداع کہا۔ کل سویرے آنیہ اور نہار کو بذریعہ بس واپس جالندھر چلے جانا تھا۔ ایک دوسرے سے فون نمبرز اور ای میل وغیرہ کا تبادلہ ہوا، الوداعی کلمات کہے گئے۔ آنیہ کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنی کوئی قیمتی چیز یہاں چھوڑے جا رہی ہے۔

اچانک ایک جانب سے راسو وارد ہوا اور ایک سیاہ گلاب آنیہ کو پیش کردیا۔ موقع ایسا تھا کہ وہ انکار بھی نہ کرسکی اور گلاب تھام لیا۔ وہ بالکل سیاہ نہیں تھا بلکہ پتیوں کے باہری کنارے ہلکے سے گلابی تھے۔ اس شیڈ نے پھول کو ایک منفرد Look دے دی تھی۔

راسو بولا۔ ''یہ بڑا کمیاب پھول ہے۔ شاذونادر ہی نظر آتا ہے۔ اب بھی صرف ایک ہی ملا ہے۔ ورنہ ایک مس نہار کو بھی پیش کرتا۔''

شہابی نے ہنس کر کہا۔ ''تو مس آنیہ کو ہی کیوں پیش کیا؟''

''اس لیے کہ یہ پینٹر بھی ہیں، رنگوں سے کھیلتی ہیں۔ اگر...... نہار صاحبہ چاہیں تو میں ایک اور پھول کی کوشش بھی کرلیتا ہوں۔''

''نہیں نہیں...... بہت زیادہ شکریہ۔'' نہار جلدی سے بولی۔ ''آپ نے کہہ دیا۔ سمجھیں مجھے مل گیا۔ پہلے ہی بہت دیر ہوگئی ہے۔'' اس نے رسٹ واچ دیکھتے ہوئے کہا۔ آنیہ کی طرح اس کے تاثرات بھی راسو کے بارے میں کچھ اچھے نہیں تھے۔

کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں ایک ''ٹیکسی'' میں بیٹھی واپس اپنی قیام گاہ پر جارہی تھیں۔ سیاہ گلاب خوب صورت تھا مگر آنیہ کو لگا جیسے وہ ڈراؤنا ہے، اسے اس کے اندر سے بھی سگریٹ کی بو نکلتی محسوس ہوئی۔ اس نے بڑی سڑک پر پہنچ کر اسے باہر پھینک دیا۔

☆☆☆

راجوری سے جالندھر واپس آئے آنیہ کو ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ جو دو تین دن وہاں گزرے تھے، وہ اس کے حافظے پر نقش ہو چکے تھے۔ ایک کشش سی تھی جو اسے مسلسل شہابی کی طرف کھینچتی تھی۔ دو تین بار فون پر بھی اس سے بات ہو چکی تھی۔ شہابی کی شدید خواہش تھی کہ آنیہ مصوری کے اس اہم مقابلے میں حصہ لے اور اس حوالے سے دنیدھر فورٹ کو اپنے کام کا حصہ بنائے۔ ہر مصور کسی بھی مونومینٹ کی چار پینٹنگز اس ''کمپی ٹیشن'' میں شامل کرسکتا تھا۔ یہ ایک انٹر یونیورسٹی ایونٹ تھا اور اسے کافی پروجیکشن ملنے والی تھی۔

شہابی حیدر اور آنیہ کے درمیان جو کچھ چل نکلا تھا، نہار کور بھی اس سے بہ خوبی آگاہ تھی۔ وہ اس حوالے سے بڑی شوخ تھی۔ وہ آنیہ کو مسلسل مشورہ دے رہی تھی کہ وہ راجوری جائے اور مقابلے میں حصہ لے۔ اس سلسلے میں اس نے خود ہی آنیہ کے پاپا سے بھی بات کر چھوڑی تھی اور انہیں باور کرایا تھا کہ اسے اس مقابلے میں حصہ لینا چاہیے۔ اس نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اس نے دفتر سے ڈیڑھ ماہ کی چھٹی لے رکھی ہے اور وہ آنیہ کے ساتھ راجوری جانے کے لیے تیار ہے۔ وہاں وہ دونوں پہلے کی طرح بڑی سہولت سے دلبر ماموں کے گھر پر قیام کرسکیں گی۔

آنیہ کی ماما اس آئیڈیا کی سخت مخالف تھیں۔ گھر میں دو تین سنجیدہ قسم کی جھڑپیں بھی ہوئیں۔ پاپا ہمیشہ کی طرح آنیہ کی سائیڈ لے رہے تھے مگر ماما کا لب و لہجہ بڑا سخت تھا۔ انہوں نے آنیہ کے پاپا کو مخاطب کرتے ہوئے واشگاف الفاظ میں کہا۔ ''آپ بیٹی کو ضرورت سے زیادہ ڈھیل دے رہے ہیں۔ یہ آپ کے لاڈوں سے ہی بگڑی ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ سنبھل جائیں۔ یہ پڑھائیاں اور مصوریاں وغیرہ بعد میں بھی ہوتی رہیں گی۔ اس کے ہاتھ پیلے کریں

www.pakistanipoint.com

اور اس کے گھر بھیجیں اِسے، میں تو کہتی ہوں کہ یہ فرحان کی سعادت مندی ہے اور آپا مریم کی بھی مہربانی ہے کہ اس کی تیزی طراری کو نظر انداز کررہے ہیں وہ لوگ۔ ہم ایسا رشتہ ڈھونڈنے نکلیں گے تو دانتوں پسینے آجائیں گے۔''

کافی بحث بحثی ہوئی لیکن بالآخر آنیہ اور اس کے پاپا کے سامنے ماما کو اپنا رویّہ کچھ نرم کرنا پڑا۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھیں کہ بیٹی بالکل ہی خودسر ہوجائے اور اپنی مرضی کرنے لگے۔ اس سلسلے میں کچھ کردار نہار کے ماموں دلبر سنگھ صاحب نے بھی ادا کیا۔ وہ بہت دلچسپ باتیں کرتے تھے اور ہر کسی کو شیشے میں اتارنے کا فن جانتے تھے۔ وہ اپنے کسی کام سے امرتسر آئے ہوئے تھے۔ وہیں سے جالندھر آنیہ کے گھر آن ٹپکے۔ وہ جب آنیہ کو پُتری یا دھی رانی کہہ کر بلاتے تھے تو ایسا لگتا تھا جیسے وہ واقعی ان کی بیٹی ہے۔ انہوں نے آنیہ کی ماما کو پورا یقین دلایا کہ آنیہ بڑی سہولت اور حفاظت سے ان کے گھر رہے گی۔ نہار بھی اس کے ساتھ ہوگی، دونوں کا وقت اچھا گزرے گا۔

ایک رات جب ماما دوا کھا کر سورہی تھیں اور آنیہ بیسمنٹ میں پاپا کے ساتھ موجود تھی، پاپا نے ایک کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے پوچھا۔ ''مجھے خوشی ہوئی ہے کہ تم نے ''شیر بچّے'' والی تصویر سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا کھوج لگالیا۔ اب تو میرا دل چاہنے لگا ہے کہ تمہاری اس نئی دریافت شہابی حیدر سے ملا جائے۔ دیکھنے میں بھی کافی شاندار لگتا ہے۔''

''جی ہاں۔'' آنیہ کے چہرے پر رنگ سا لہرا گیا پھر جلدی سے بولی۔ ''اور پاپا! اصل بات اس کی ظاہری شکل صورت میں نہیں، اصل بات اس کے مزاج اور شخصیت میں ہے۔ وہی بے باکی، وہی دلیری اور وہی ظالم کا پنجہ مروڑنے والی خُو بُو۔ سمجھیں سارے ڈانڈے اسی تصویر سے جا کر ملتے ہیں۔''

اس کے پاپا دھیان سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر خاموش رہ کر بولے۔ ''تمہارے بعد ایک دن فرحان آیا تھا۔ کچھ اَپ سیٹ لگ رہا تھا۔ اسے لگتا ہے کہ شاید تم اسے پوری اہمیت نہیں دیتی ہو۔''

آنیہ ٹھنک کر بولی۔ ''پاپا...... میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا تھا، مجھے اس میں کوئی اہمیت والی بات نظر آئے تو میں اسے اہمیت دوں ناں، ایک اور گاڑی...... ایک اور مہنگا فون، ایک اور پلاٹ...... یہ باتیں اہمیت دینے والی تو نہیں ناں......''

''لیکن بیٹا! اس سے تمہاری بات چل رہی ہے۔ تمہاری ماما اس بارے میں بڑی سنجیدہ ہیں۔''

''وہی سنجیدہ ہیں ناں۔'' آنیہ نے عجب بیزاری سے کہا پھر جلدی سے بات بدل کر بولی۔ ''پاپا! آپ نے بھی کیا بدمزہ کرنے والا موضوع چھیڑ دیا۔ پلیز چھینج اِٹ...... میں آپ کے لیے بڑا اچھا سا قہوہ بنا کرلاتی ہوں۔'' وہ ان کے کندھے دباتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف چلی گئی، بیرسٹر خورشید عالم پُرسوچ نظروں سے اس کی جانب دیکھتے رہے۔

......راجوری سے واپسی کے تین ہفتے بعد آنیہ اور نہار ایک بار پھر راجوری کا رخ کررہی تھیں۔ اس مرتبہ مصوری کے سارے لوازمات ایزل، پائلٹ، برش اور رنگ آنیہ کے ہمسفر تھے۔ نہار مستقبل قریب میں ہسٹری میں ڈاکٹریٹ کا پروگرام بنارہی تھی۔ وہ اس سلسلے میں راجوری ڈسٹرکٹ اور اردگرد کے قلعہ جات پر کچھ کام کرنا چاہ رہی تھی۔ بہرحال یہ بات نہار بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ راجوری میں اس کی واپسی کی اصل وجہ وہ ایک انوکھا رومانی تعلق ہی ہے جو آنیہ اور شیر بچّے کے پوتے کے درمیان پیدا ہوا ہے۔ یوں لگتا تھا کہ اس تعلق کا پیدا ہونا جیسے بہت عرصہ پہلے ہی ٹھہر گیا تھا۔

حسبِ سابق وہ قریباً 370 کلومیٹر کا فاصلہ سات آٹھ گھنٹے میں طے کرکے راجوری، ٹاؤن پہنچ گئیں۔ دلبر ماموں کی طبیعت زکام کی وجہ سے کچھ ناساز تھی لہٰذا بس اسٹینڈ پر انہیں شہابی حیدر نے خود ریسیو کیا۔ وہ ہاف سلیو سفید ٹی شرٹ اور نیلی جین میں بڑا باوقار لگ رہا تھا۔ اس کے پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے آنیہ نے عجیب سنسنی محسوس کی۔ ایک ایسی سنسنی جس میں بے خوفی اور تحفظ کا احساس بھی بدرجۂ اتم موجود تھا۔

آنیہ نے سب سے پہلے اس نوعمر جوڑے کے بارے میں ہی پوچھا جو محبت اور شادی کی پاداش میں چھپتا پھرتا تھا۔ شہابی نے بتایا۔ ''وہ ایم پی اے صاحب کے پاس ہیں۔ میں ان کی طرف سے پوری طرح باخبر ہوں۔ لڑکے ظہیر کی والدہ بھی وہیں پر ہیں۔ میں ہر روز دو تین دفعہ انہیں فون کرتا ہوں۔ کوششیں ہورہی ہیں کہ لڑکی کے گھر والے تہِ دل سے اسے معاف کریں اور کچھ ایسے معتبر ضامن ہوں جو لڑکی لڑکے کی حفاظت کی ذمّے داری قبول کریں۔''

''اس روز جو بڑی توند والا ٹھیکیدار بڑھ بڑھ کر بول رہا تھا، وہ کون تھا؟'' نہار نے پوچھا۔

''وہی خبیث سارے فساد کی جڑ ہے۔ ٹھیکیدار تو ویسے ہی اس کی عرفیت بن گئی ہے۔ اس کا اصل نام ترائن

www.pakistanipoint.com

ڈوٹ ہے۔ تھوڑا بہت سیاست میں بھی پاؤں رکھتا ہے۔ یہ لڑکی جس نے کورٹ میرج کی ہے اس کے ''کپڑا اسپلائی'' کے کارخانے میں کام کرتی رہی ہے۔ باپ بھی وہیں پر کام کرتا ہے۔ نرائن کی اس لڑکی پر نظر تھی۔ پر اب یہ نرائن لڑکی کے باپ سلیم کا سب سے بڑا ہمدرد بنا ہوا ہے اور اسے اور اس کے خاندان کو بھڑکا رہا ہے۔''

''اب کیا چاہتے ہیں یہ لوگ؟'' آنیہ نے پوچھا۔

''چاہنا کیا ہے۔ وہ اس نکاح کو مانتے ہی نہیں۔ کہتے ہیں ہماری لڑکی کو جان سے مارنے کی دھمکیاں دے کر نکاح کیا ہے۔ یہ لڑکی کو واپس لے جائیں گے۔ اس کے ایک ملنگ نما کزن سے اس کی شادی کر دیں گے۔ لڑکے کی ٹانگیں شانگیں توڑ کر اسے کہیں پھینک دیں گے لیکن اب ہم ایسا ہونے نہیں دیں گے۔''

...... آنیہ کی نگاہوں میں لڑکے لڑکی کی ڈری سہی صورتیں گھوم گئیں۔ وہ ان کبوتروں کی طرح دکھائی دیے تھے جن کے گرد کوئی خوفناک بلی گھوم رہی ہو اور وہ دم بخت ہو گئے ہوں۔

اسی دوران میں شہابی کے فون پر کال آ گئی۔ پیدل چلنے کے دوران میں وہ بات کرنے لگا۔ ''زیادہ ہوشیار مت بنو۔ ایس ایچ او سے بات کراؤ میری۔'' وہ تڑخ کر بولا۔

چند سیکنڈ بعد وہ یوں گویا ہوا۔ ''ایس ایچ او رمضان بول رہا ہے؟ ہاں میں شہابی بول رہا ہوں۔ مجھے لگتا ہے تم ایزی لے رہے ہو...... یہ بڑا نقصان دہ ہو جائے گا تمہارے لیے۔''

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا جسے شہابی نے سرخ چہرے کے ساتھ سنا پھر پھنکارا۔ ''تم مجھے قانون مت پڑھاؤ۔ جب ملزم کی ضمانت ہو گئی ہے تو پھر موٹر سائیکل کو کیوں اپنی ٹانگوں میں گھسا کر بیٹھے ہوئے ہو۔ مجھے ایک گھنٹے میں موٹر سائیکل تھانے سے باہر چاہیے۔'' منہ میں کوئی سخت لفظ بڑبڑا کر شہابی نے فون بند کر دیا۔ اس کا چہرہ بدستور سرخ تھا۔

چند سیکنڈ بعد آنیہ نے پوچھا۔ ''کیا ہوا ہے؟''

پہلے تو شہابی نے گول مول بات کی، پھر بتا دیا کہ راسم کو کسی واردات کے شبہے میں پکڑ لیا گیا تھا لیکن کل اس کی ضمانت ہو گئی ہے۔

''واردات کیا تھی؟'' نہار نے پوچھا۔

''بینک سے نکلنے والے کسی بندے سے کچھ رقم چھینی گئی تھی۔ واردات کا شکار ہونے والا ٹھیک سے بائیک کا نمبر نہیں پڑھ سکا۔ ملتے جلتے نمبروں والے دو تین لڑکے پکڑ لیے گئے۔''

آنیہ اور نہار نے کن انکھیوں سے ایک دوجے کی طرف دیکھا۔ انہیں پہلے سے اندازہ تھا کہ شہابی کے یاروں دوستوں میں سے یہ راسو کچھ علیحدہ ٹائپ کا ہے۔ اب ان کے اندازے اور شبہے کو مزید تقویت مل رہی تھی۔

بہرحال اس موضوع پر شہابی حیدر نے مزید کوئی بات نہیں کی۔ آنیہ اور نہار نے بھی چپ رہنا مناسب سمجھا۔

گھر پہنچ کر آنیہ اور نہار کو معلوم ہوا کہ زکام بخار تو صرف بہانہ تھا ورنہ دلبر ماموں کی طبیعت خوش خوراکی کی وجہ سے خراب ہوئی تھی۔ اکیلے میں انہوں نے فوراً ہی اس کا اعتراف بھی کر لیا۔ اپنے مخصوص لہجے میں بولے۔ ''دراصل، میں پھر سے ڈائٹنگ شروع کرنے والا تھا۔ سوچا کہ اس سے پہلے ایک بار ذرا رج کے بدپرہیزی ہی کر لوں۔ گلاب جامن اور موتی چور کے لڈو میری کمزوری ہیں...... اور اس ویلے میری کمزوری کی وجہ بھی ہیں۔ کافی سارے موشن آئے ہیں۔ کل تک تو اٹھا بھی نہیں جا رہا تھا مگر اب ٹھیک ہوں۔ ابھی کچھ دیر بعد پاکستانی ڈراما شرطیہ مٹھے دیکھوں گا تو طبیعت اور بھی مٹھی مٹھی ہو جائے گی۔ وشواس کرنا، شرطیہ مٹھے شرطیہ طور پر چالیس پچاس واری دیکھ چکا ہوں، اسی طرح لنڈا بازار...... بڑا مزہ آئے گا...... اور فیقا اِن امریکا وغیرہ ہیں۔'' وہ بے تکان بولتے چلے گئے۔

وہ سیاست پر بھی مزیدار گفتگو کرتے تھے۔ ان کی باتوں سے پتا چلتا تھا کہ وہ انڈین حکومت اور انڈیا میں ہندوؤں کی بالادستی سے خوش نہیں ہیں۔ فوج سے ان کے نکل جانے کی وجہ بھی یہی ناخوشی تھی۔ 1984ء میں دربار صاحب کے خونی واقعات اور بعد میں اندرا گاندھی کے قتل کے نتیجے میں سکھوں پر ہونے والے ظلم و ستم نے انہیں موجودہ نظام سے متنفر کر دیا تھا۔

آنیہ نے شہابی کے مشورے کے مطابق اگلے ہی روز سے فورٹ میں جا کر اپنا کام شروع کر دیا۔ اس نے ایک خستہ حال محراب کے عقب میں نظر آنے والا لینڈ اسکیپ منتخب کیا اور اس کو رنگوں کی مدد سے کینوس پر اتارنا شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں شہابی نے اپنا رسوخ استعمال کرتے ہوئے اسے نہ صرف پینٹنگ کی اجازت لے کر دی بلکہ دیگر سہولیات بھی مہیا کیں۔ یہ مصوری آنیہ نے فقط اس لیے شروع کی تھی کہ شہابی کو قریب سے دیکھنے اور اُسے سمجھنے کا موقع ملے...... لیکن جب ایک بار کینوس سے رنگوں کا ملاپ

شروع ہوا تو پھر بتدریج آنیہ کو اس میں دلچسپی محسوس ہونے لگی۔ شہابی اپنی موٹر بائیک یا چھوٹی گاڑی پر سوار گاہے بگاہے فورٹ کا چکر بھی لگا لیتا تھا۔

ایک دن وہ آیا تو آنیہ ایزل کے سامنے کھڑی بڑی محویت سے برش چلانے میں مصروف تھی۔ اس نے عقب سے آکر ایک دم زور سے ہیلو کہا تو وہ جیسے بدک گئی۔ رنگ میں لتھڑے ہوئے برش نے پینٹنگ پر ایسا اسٹروک لگا دیا جو وہ ہرگز نہ چاہتی تھی۔ وہ سٹپٹا گئی۔ ''یہ آپ نے کیا کر دیا شہابی؟'' وہ منہ بسور کر بولی۔

''افوہ...... یہ تو واقعی غلطی ہوگئی۔'' شہابی نے تصویر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن مجھے ہرگز پتا نہیں تھا کہ آپ یوں ڈر جائیں گی، ویری سوری۔''

آنیہ نے جلدی جلدی پائلٹ میں کچھ اور رنگ مکس کیے اور اس اضافی اسٹروک کو مہارت سے چھپا دیا۔ اس دوران میں شہابی پشیمان سا گم صم کھڑا رہا۔ آخر میں اس نے توصیفی نظروں سے تصویر کو دیکھا اور بولا۔ ''بھئی واہ، آپ تو چھپانے میں مہارت رکھتی ہیں۔''

''آپ شاید زیادہ رکھتے ہیں۔'' وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔

''اس کو مہارت نہ کہیں...... یہ تو خوف ہے۔'' وہ بھی معنی خیز لہجے میں بولا۔

''کس بات کا خوف؟''

''انکار کا...... ناراضگی کا۔''

اُس کے چہرے پر بالوں کی لٹیں جھوم رہی تھیں۔ انہیں برش کے پچھلے حصے سے اپنے کان پر اڑس کر وہ بولی۔ ''ناراضگی تو ناراض ہونے والی بات پر ہوتی ہے۔''

''کچی بات؟'' اس نے مسکرا کر پوچھا۔

آنیہ کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ سنہری دھوپ نے اس سرخی میں آمیزش کی اور اسے کچھ اور بھی دلکش بنا دیا۔

''آپ پتا نہیں کیا پہیلیاں بجھوا رہے ہیں، ایک تو یکایک نازل ہو کر خراب کیا، اب وقت بھی خراب کر رہے ہیں۔'' آنیہ نے ڈھلتے سورج کی طرف دیکھ کر کہا۔

''تو ٹھیک ہے، میں چلا جاتا ہوں۔''

وہ سچ مچ مڑا اور بڑے اسٹائل سے چلتا ہوا اپنی چمک دار موٹر بائیک کی طرف بڑھ گیا۔

وہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی مگر جب لگا کہ وہ واقعی بائیک اسٹارٹ کر کے چلا جائے گا تو بولی۔ ''سنیے۔''

وہ بھی شاید اسی آواز کا منتظر تھا فوراً پلٹ آیا...... اور سن گلاسز اتار کر چیسٹ پاکٹ میں اُڑس لیے۔ بہت ڈیسنٹ لگ رہا تھا۔ وہ ادا سے بولی۔ ''آپ نے سوری کہا ہے۔ معذرت کی ہے لیکن یہ تو جانا ہی نہیں کہ میں نے معذرت قبول کی یا نہیں؟''

''اوہ ہاں، یہ تو واقعی ٹیکنیکل غلطی ہوئی۔ آپ نے معذرت قبول کی یا نہیں؟''

''غیر مشروط طور پر قبول نہیں کی۔ اب میرا کام کا موڈ بالکل اُڑن چھو ہوگیا ہے۔'' آنیہ نے برش اور پائلٹ وغیرہ ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

''آرٹسٹوں کا موڈ یقیناً اچھی چائے وغیرہ سے بحال ہوتا ہے اور یہاں قریب ہی راجوری ٹاؤن کی سب سے اچھی چائے ملتی ہے۔''

وہ مسکرا دی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ذرا سی ہچکچاہٹ کے ساتھ شہابی کے پیچھے بیٹھی ہوئی بائیک پر بیٹھ رہی تھی، اس کے کشادہ کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کو اپنے اندر ایک عجیب سی فرحت بخش کپکپی محسوس ہوئی۔

اگلے آٹھ دس روز بڑے دلکش تھے، سوائے اس کے کہ دو تین بار جالندھر سے اس کے خالہ زاد فرحان کا فون آیا اور وہ اس کی عامیانہ باتیں سن کر بدمزہ ہوئی۔ آنیہ سے شہابی کی ملاقات تقریباً روز ہی ہو جاتی تھی۔ آنیہ صبح نہار کے ساتھ ہی دلبر ماموں کے گھر سے نکلتی تھی، سواری عموماً رکشا یا ٹیکسی ہی ہوتی تھی۔ نہار، آنیہ کو دنیدھر فورٹ پر اتار دیتی تھی اور خود راجوری ٹاؤن کی بڑی لائبریری کی طرف چلی جاتی تھی۔ وہ مختلف زبانوں اور پرانے مخطوطوں کو پڑھنے اور جاننے کا زبردست شوق رکھتی تھی۔ یہاں راجوری میں اسے کچھ ایسی کتابیں مل گئی تھیں جو ڈاکٹریٹ کے تھیسس میں اس کے کام آسکتی تھیں۔ آنیہ نے دو شاندار پینٹنگز مکمل کر لی تھیں اور تیسری پر کام شروع کر دیا تھا۔ دن کے کسی حصے میں شہابی بھی فورٹ پر آجاتا۔ اگر لنچ کا پروگرام بنتا تو وہ لنچ پر چلے جاتے یا پھر اپنے پسندیدہ چائے خانہ میں کشمیری چائے یا قہوہ پی کر واپس آجاتے، وہ دونوں بتدریج ایک دوسرے کے قریب آرہے تھے۔ نصف دن گزر جاتا تو آنیہ شدت سے اس کا انتظار کرنے لگتی۔ جبکہ شہابی کے تاثرات سے بھی صاف پتا چلتا تھا کہ وہ اس سے ملنے کے لیے بے چین رہتا ہے۔ انہیں ایک دوسرے کی عادت ہوتی جارہی تھی اور جیسے بہار کی سہ پہر دھیرے دھیرے ایک دلکش شام میں ڈھلتی ہے یہ عادت بھی محبت میں ڈھل رہی تھی،

www.pakistanipoint.com

ایک دن وہ دونوں بڑے اچھے موڈ میں ایک ریسٹورنٹ کے اوپن ایریا میں بیٹھے تھے کہ وہی، بڑھی ہوئی شیو اور لمبے بالوں والا راسم عرف راسو وہاں آدھمکا۔ وہ جیسے ایک ہی لمحے میں آنیہ کو سرتاپا دیکھ لیتا تھا اور اپنی آنکھوں کے اندر جذب بھی کر لیتا تھا۔ اس کا یوں دیکھنا آنیہ کو بڑا الارمنگ لگتا تھا۔ آج تو وہ ویسے بھی بڑے اکھڑے اکھڑے موڈ میں تھا۔ اس کے ہاتھ پر ایک میلی سی سفید پٹی بندھی ہوئی تھی۔ یہ اس واقعے کی نشانی تھی جب کسی ڈکیتی کے شبہے میں اسے پولیس نے پکڑا تھا اور شاید اس کے ساتھ کچھ مار پیٹ بھی ہوئی تھی۔ آتے ساتھ ہی وہ بھناّئے ہوئے انداز میں شہابی حیدر سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اِدھر ذرا اکیلے میں آ کر میری بات سن لو۔''

''ایکسکیوزمی آنیہ! بس ایک منٹ۔'' شہابی نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

دونوں ایک طرف جا کر کچھ کھُسر پھُسر کرنے لگے۔ راسو ابتر موڈ میں تھا اور ہاتھ ہلا ہلا کر طیش میں باتیں کر رہا تھا۔ گفتگو کے آخر میں راسو کی آواز کچھ بلند ہو گئی۔ اس کے ایک دو فقرے آنیہ کے کانوں تک بھی پہنچے۔ ایک فقرہ کچھ اس طرح تھا۔ ''اسے ہر صورت سرجری کی ضرورت ہے مگر کسی بڑے اسپتال میں لے جائیں گے تو فوراً گرفتاری ہو جائے گی۔''

کچھ دیر بعد شہابی حیدر اسے رخصت کر کے واپس میز کی طرف آ گیا۔ جو آئسکریم وہ دونوں کھا رہے تھے، وہ پگھل چکی تھی۔ شہابی نے آئسکریم دوبارہ منگوانا چاہی تو آنیہ نے منع کر دیا۔ اس کا موڈ غارت ہو چکا تھا۔ وہ دونوں باہر آ گئے۔ شہابی آج کار پر آیا تھا۔ دونوں کار میں بیٹھ گئے۔ آنیہ نے راسو کی آمد کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ شہابی نے بھی کچھ نہیں بتایا۔ اس کی آمد پر وہ ایسے ہی گم صم ہو جایا کرتی تھی۔ شہابی کچھ دیر اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس کے بے ترتیب ریشمی بالوں کو اپنی انگلیوں کی کنگھی سے سنوارا۔ اس کے رخسار کے تل کو بڑی نرمی کے ساتھ اپنی شہادت کی انگلی سے چھوا اور جذب سے بولا۔ ''آنیہ میں جانتا ہوں وہ آپ کو اچھا نہیں لگتا، شاید وہ بہت سے لوگوں کو اچھا نہیں لگتا لیکن میں اس کے ساتھ ایک دیرینہ تعلق کی زنجیر سے بندھا ہوا ہوں۔ وہ آپا خالہ کا بیٹا ہے اور میری زندگی کا بڑا حصہ اس کے ساتھ گزرا ہے۔ پلیز میری اس مجبوری کو سمجھیں۔''

اس نے آخری الفاظ کچھ ایسی اپنائیت اور انکساری سے کہے تھے کہ آنیہ کو اپنا غصہ کافور ہوتا محسوس ہوا۔

آنیہ کے تاثرات دیکھ کر شہابی مطمئن ہو گیا۔ اُس نے بیٹھے بیٹھے آنیہ کو اپنے ساتھ لگایا اور پھر گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

دوسرے روز ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ہڑتال کی وجہ سے سواری دستیاب نہیں تھی مگر آنیہ کو پینٹنگ پر کام کرنے کے لیے فورٹ بھی لازمی جانا تھا۔ شہابی کو پتا چلا تو وہ خود گاڑی پر آنیہ کو لینے آ گیا۔ ماموں دلبر سے اجازت لے کر آنیہ گاڑی میں آ بیٹھی۔ وہ زیادہ دور نہیں گئے تھے جب ایک جگہ سڑک کے کنارے جمگھٹا سا نظر آیا۔ ایک شاندار بلیو کار سڑک کے کنارے کھڑی تھی۔ قریب ہی ایک نہایت پھٹیچر سی موٹر سائیکل الٹی پڑی تھی۔ ایک ممی ڈیڈی ٹائپ لڑکا جو یقیناً کار سے نکلا تھا، ایک ادھیڑ عمر شخص سے جھگڑ رہا تھا۔ وہ طیش میں بار بار اس شخص کو دھکے دے رہا تھا۔ فیشن ایبل لڑکے کی عمر مشکل سے سولہ سترہ سال رہی ہو گی، تاہم قد کی وجہ سے وہ بڑا لگتا تھا۔

یہ منظر دیکھ کر شہابی نے بے ساختہ بریک لگا دیے۔ اس کے چہرے پر مخصوص سرخی جھلک دکھانے لگی تھی۔ ''ایک منٹ آنیہ۔'' اس نے کہا اور پھر موبائل پر بات کرنے لگا۔ ''تم کہاں ہو بیدی؟...... ٹھیک ہے...... کیمرا پاس ہی ہے؟...... جلدی آؤ...... دو منٹ میں۔'' شہابی نے کہا اور فوراً گاڑی سے نکل کر موقع پر پہنچ گیا۔

آنیہ وہیں گاڑی میں بیٹھی رہی۔ اُسے جھگڑے کے مناظر نظر آ رہے تھے۔ شہابی جاتے ساتھ ہی دراز قد امیر زادے اور مفلوک الحال شخص کے درمیان آ گیا۔ وہ دونوں کو تحمل کا مشورہ دے رہا تھا مگر اسی دوران میں ایک اور لگژری جیپ وہاں پہنچ گئی۔ اس میں سے ایک فربہ اندام بارعب شخص نکلا۔ جیسا کہ آنیہ کو بعد میں معلوم ہوا وہ فیشن ایبل لڑکے کا باپ تھا۔ اس کا نام مہندر ناتھ تھا اور وہ ایک بڑا بیوروکریٹ تھا۔ اس کا رویّہ اپنے بیٹے سے بھی بدتر نکلا۔ اس نے آتے ساتھ ہی اپنی افسرانہ شان دکھانا شروع کر دی۔ اسی دوران میں آنیہ نے دیکھا کہ نیلی پگڑی والا وہ سکھ کیمرا مین بھی موقع پر پہنچ گیا جسے شہابی حیدر نے ہنگامی طور پر بلایا تھا۔

دوسری طرف جھگڑا مزید زور پکڑ چکا تھا۔ چٹاخ کی آواز سنائی دی اور ہٹّے کٹّے بیوروکریٹ نے ایک طمانچہ ادھیڑ عمر شخص کے منہ پر جڑ دیا۔ اس حرکت پر شہابی بھی مشتعل نظر آنے لگا۔ آنیہ نے دیکھا کہ شہابی اور مہندر ناتھ کے درمیان زوردار مکالمہ ہو رہا تھا۔ وہ بھی گاڑی سے نکل کر

www.pakistanipoint.com

موقع پر پہنچ گئی۔ اس کے پہنچتے پہنچتے مہندر ناتھ قدرے ٹھنڈا ہو گیا۔ مفلوک الحال شخص اپنے حلیے سے مسلمان ہی نظر آتا تھا۔ مہندر ناتھ نے اسے مخاطب کرتے ہوئے نسبتاً نرم لہجے میں کہا۔ ”دیکھو بڑے بھائی! بات جتنی بڑھاؤ گے بڑھتی چلی جائے گی۔ حاصل وصول کچھ نہیں ہونا ہے۔ بچّے کی ٹانگ پر چوٹ لگی ہے۔ بھگوان نے اس کی جان بچالی ہے۔ آٹھ دس روز میں ٹھیک ہو جائے گا۔ تمہارے چھوٹے بھائی کو بھی معمولی رگڑیں آئی ہیں۔“

اس نے اپنی واسکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ کچھ دیر اپنے نوعمر بیٹے کے ساتھ کانا پھوسی کی پھر ہزار ہزار کے چار نوٹ ادھیڑ عمر شخص کی طرف بڑھا دیے۔

رقم دیکھ کر ادھیڑ عمر شخص متذبذب نظر آنے لگا۔ چند لمحے کے لیے یوں محسوس ہوا کہ وہ رقم تھام لے گا مگر اسی دوران میں شہابی بول اٹھا۔ ”ٹھہرو انکل! پہلے اسپتال سے معلوم کرنے دو۔“

شہابی اپنے فون سے اسپتال کا نمبر ملانے لگا۔ اردگرد جو باتیں ہو رہی تھیں، ان سے آنیہ کو پتا چلا۔ ادھیڑ عمر شخص کا نام رحیم ہے۔ سامنے ہی اس کی چھوٹی سی بیکری تھی۔ رحیم کا چھوٹا بھائی سلیم، رحیم کے آٹھ نو سالہ بیٹے کو لے کر دکان پر آرہا تھا کہ اس تیز رفتار کار نے چچا اور بھتیجے کو ٹکر ماردی۔ اب وہ دونوں تو ایک رکشا والے کی مدد سے اسپتال پہنچ گئے تھے اور یہاں زخمی بچے کا باپ عبدالرحیم کار والے کو روکے کھڑا تھا۔ کار سوار نوجوان لڑکے نے بچے کو زخمی کرنے کے علاوہ ایک کھڑی وین کو بھی ٹکر مار کر نقصان پہنچایا تھا۔

اسپتال فون کرنے کے بعد شہابی کا چہرہ کچھ اور تمتما گیا۔ وہ مہندر ناتھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”آپ جسے ٹانگ کی معمولی چوٹ فرما رہے ہیں، وہ معمولی نہیں ہے۔ بچّے کی ٹانگ تین جگہ سے ٹوٹ چکی ہے۔ بُری طرح مضروب ہوا ہے وہ۔“

”لیکن...... اس میں سارا دوش میرے بچّے کا تو نہیں......“

”آپ بالکل ٹھیک فرما رہے ہیں۔ اس میں سارا دوش آپ کے بچے کا نہیں...... کیا یہ آپ کی ذمّے داری نہیں تھی کہ آپ اپنے اس کم عمر بچے کو گاڑی لے کر نکلنے سے روکتے۔ اس کا تو ابھی شناختی کارڈ بھی نہیں بنا ہوگا، لائسنس کہاں بن گیا ہوگا......“

مہندر ناتھ کے چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، موقع پر موجود ایک ٹریفک سارجنٹ آگے بڑھا...... اور شہابی کو ایک طرف لے جا کر کانوں میں بات کرنے لگا۔ آنیہ کو صاف پتا چلا کہ وہ جیپ سوار مہندر ناتھ، کا شناسا ہے اور اس کی طرف داری میں کچھ کہہ رہا ہے۔

حسب توقع شہابی حیدر نے انکار میں سر ہلایا۔ وہ پلٹ کر مہندر ناتھ کی طرف آیا اور فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ”مہندر صاحب! آپ اس طرح اس غریب فیملی کو نہیں دبا سکتے۔ آپ کی اور آپ کے بچّے کی طرف سے زیادتی ہوئی ہے۔ آپ جو چار ہزار روپیا اس پریشان باپ کو پیش کر رہے ہیں یہ تو بچے کے علاج کے پہلے دو تین روز میں ہی ٹھکانے لگ جائے گا...... یہ احسان آپ نہ ہی کریں تو اچھا ہے۔“

”تو پھر اچھا کیا ہے؟“ مہندر ناتھ کا جوشیلا بیٹا تنک کر بولا۔

”اچھا یہ ہے کہ تم بھی اپنے پتا کی طرح اس بوڑھے شخص کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ لگاؤ بلکہ ایک سے زیادہ لگاؤ تاکہ اسے سمجھ آئے کہ جب تم جیسے امیر زادے سڑک پر ہوں تو سب ایروں غیروں کو اپنی جان کی قدروقیمت جانتے ہوئے سڑک خالی کردینی چاہیے۔“

لڑکا گرجا۔ ”اوئے دو ٹکے کے صحافی، منہ سنبھال کر بات کر...... ورنہ......“

”ورنہ کیا؟“ شہابی نے کہا اور اسے دھکا دیا۔

وہ لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے چلا گیا پھر وہ تیر کی طرح شہابی کی طرف آیا۔ وہ سینہ تانے کھڑا تھا۔ مہندر ناتھ کا ایک ساتھی ان دونوں کے درمیان آگیا۔ اس دوران میں مہندر ناتھ، شہابی کے کیمرامین کو دیکھ چکا تھا اور یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے غصے میں ادھیڑ عمر شخص کو جو تھپڑ رسید کیا ہے، وہ بھی ریکارڈ ہو چکا ہے۔ اس کے تیور ایک بار پھر بدل گئے۔ اس نے مشتعل بیٹے کو جھاڑا...... اپنے دو ساتھیوں اور سارجنٹ سے مشورہ کیا۔ پھر ہزار ہزار کے پورے بارہ نوٹ نکال کر ادھیڑ عمر عبدالرحیم کی طرف بڑھا دیے۔ عبدالرحیم نے نوٹ لینے چاہے مگر شہابی نے ایک بار پھر منع کردیا۔ ”ان کو اپنے پاس ہی رکھیں جناب! آپ یقیناً کوئی بڑا وکیل ہی کریں گے، اتنے روپے تو وہ ایک دو پیشیوں کے ہی لے لے گا۔“

اب بیوروکریٹ مہندر ناتھ کا پتا پانی ہونے لگا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اپنے نابالغ بیٹے کو گاڑی دینے کے علاوہ اس نے سرعام مضروب بچے کے والد کو تھپڑ بھی مارا ہے۔ یہ سب

www.pakistanpoint.com

کچھ ٹی وی پر آن ایئر ہونے والا تھا۔ بھاری مالی نقصان کے علاوہ اس کی ملازمت اور نیک نامی بھی داؤ پر لگنے والی تھی۔ اب وہ ساری تن فن بھول کر مصالحت کی طرف آ رہا تھا۔ اس نے ڈری ڈری نظروں سے ٹی وی کیمرے کی طرف دیکھا، پھر عبدالرحیم اور شہابی سے ایک ساتھ مخاطب ہو کر بولا۔ ''یہاں تماشا لگ رہا ہے...... چلیں سامنے آپ کی دکان (بیکری) میں بیٹھتے ہیں۔ شانتی سے بات کرتے ہیں۔''

آنیہ دوبارہ گاڑی میں آن بیٹھی۔ معاملہ گمبھیر تھا مگر اسے حل ہونے میں آدھ گھنٹے سے زیادہ نہیں لگا۔ شہابی حیدر چہرے پر کامیابی کی چمک لیے گاڑی کی طرف آتا دکھائی دیا۔ آنیہ اس سے یہ سن کر حیران رہ گئی کہ جو شخص شروع میں رحیم کو صرف چار ہزار روپے دے کر ٹرخا رہا تھا۔ اس نے پورے ستر ہزار کا چیک دیا ہے۔ یہ رقم بچے کے علاج معالجے اور دیگر نقصانات کے لیے تھی۔ آنیہ حیرت سے شہابی حیدر کی جانب دیکھتی چلی گئی۔

☆☆☆

راجوری کی خوشگوار فضائیں تھیں اور بہار نے ہر طرف رنگ بکھیر رکھے تھے۔ پرندوں کی چہچہاہٹ، پھولوں کے رقص اور بہتے پانیوں کی موسیقی، اس ماحول میں آنیہ اور شہابی حیدر کا تعلق بڑے دلنشیں انداز میں آگے بڑھ رہا تھا۔ نہار کور اپنی سہیلی کی ہمراز ہی نہیں مددگار بھی تھی۔ آنیہ تقریباً روزانہ ہی ایک دو بار گھر میں بھی فون کر لیتی تھی۔ وہ ماما سے زیادہ پاپا سے قریب تھی اور بے تکلف بھی۔ اس نے پاپا کو شہابی حیدر کی تصویریں بھیجی تھیں اور انہیں شہابی حیدر کے بارے میں مزید بھی کافی کچھ بتایا تھا۔ کچھ واضح الفاظ میں بتایا تھا اور کچھ اشاروں کنائیوں میں۔ پاپا اپنی اکلوتی بیٹی کے پورے مزاج آشنا تھے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ اس کی سوچیں کس رخ پر جا رہی ہیں اور حقیقت یہی تھی کہ وہ خود بھی آنیہ کے خالہ زاد فرحان کو زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔

ایک روز دریائے تاوی کے کنارے کنارے موٹر بائیک پر سواری کرتے ہوئے وہ دونوں ہلکی پھلکی باتیں کر رہے تھے۔ ایک جگہ کھڈے کی وجہ سے بائیک اچھلی تو پیچھے بیٹھی ہوئی آنیہ بھی لڑکھڑا سی گئی۔ شہابی نے کہا۔ ''اتنا ہٹ کر نہ بیٹھیے...... گر جائیں گی۔''

وہ مسکرائی۔ ''ہٹ کر نہ بیٹھنے میں بھی تو ''گرنے'' کا اندیشہ ہے، ویسے آپ کے کندھے پر ہاتھ تو رکھا ہی ہوا ہے۔''

''صرف ہاتھ نہ رکھیے...... اپنی زندگی کا پورا بوجھ ڈال دیجیے میرے کندھوں پر۔ میرے لیے اس بوجھ سے بڑھ کر خوب صورت چیز اور کوئی نہیں ہو گی۔''

آنیہ کے گال دہک سے گئے۔

شہابی جلدی سے بولا۔ ''دیکھیے...... دیکھیے...... آگے پھر خراب سڑک آ رہی ہے۔''

''تو آپ اپنی رفتار تھوڑی سی کم کر دیں ناں۔'' وہ شوخی سے بولی۔

''میں اپنی رفتار کم کر دوں لیکن آپ اپنی رفتار میں تھوڑی سی تیزی نہ لائیے گا۔'' شہابی نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

دونوں بلند آواز میں ہنس دیے۔ آنیہ غیر محسوس طور پر شہابی کے قریب سمٹ گئی۔ اس روز شام کو آنیہ نے فون کے ذریعے شہابی کو بتایا کہ وہ اسے پاپا سے ملوانا چاہتی ہے۔

''یعنی آپ مجھے جالندھر لے کر جائیں گی؟'' شہابی نے پوچھا۔

''نہیں جالندھر کو یہاں لاؤں گی...... بھئی وڈیو لنک کے ذریعے بات کریں گے آپ...... اپنی وہ لائنوں والی وائٹ شرٹ پہن لیجیے گا۔ اچھی لگتی ہے آپ کو۔'' وہ دبے لہجے میں کہہ گئی۔

وڈیو لنک کے ذریعے بات کرنے کا پروگرام اگلے روز کا تھا مگر دوپہر کو ایک غیر متوقع واقعہ ہوا۔ صبح کے وقت وہ حسب معمول نہار کور کے ساتھ دنیدھر فورٹ پہنچی۔ آنیہ کو اتار کر نہار آگے نکل گئی۔ اچانک آنیہ کو یاد آیا کہ اسے ایک چھوٹا برش بھی چاہیے۔ اس نے نہار کو آواز دینا چاہی مگر وہ کافی آگے نکل چکی تھی۔ اس نے کچھ سوچا اور پیدل ہی ایک بغلی سڑک پر مڑ گئی۔ یہاں انواع و اقسام کی دکانیں تھیں۔ کچھ آگے جا کر ایک اور بغلی سڑک نکلتی تھی۔ اس دوسری سڑک کے وسط میں اسٹیشنری کی ایک بڑی دکان تھی۔ وہاں سے مطلوبہ برش مل سکتا تھا۔ آنیہ نے شلوار قمیص کے ساتھ اسپورٹ شوز پہن رکھے تھے۔ اس نے بڑی سہولت کے ساتھ کوئی نصف کلومیٹر کا فاصلہ طے کر لیا۔ یکایک اس کی نگاہ قریب سے گزرتے ہوئے ایک ادھیڑ عمر شخص پر پڑی اور وہ چونک گئی۔ یہ پچاس پچپن سالہ وہی عبدالرحیم تھا، چند دن پہلے جس کے بچے کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔

''انکل!'' آنیہ نے آواز دی تو وہ ٹھٹک کر رک گیا۔

آنیہ نے پاس پہنچ کر پوچھا۔ ''انکل! آپ کے بیٹے کا اب کیا حال ہے؟''

وہ حیرانی سے آنیہ کی طرف دیکھتا رہا۔ آنیہ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی ایکسیڈنٹ کی جگہ پر موجود تھی۔ شہابی حیدر میرے ساتھ ہی وہاں آئے تھے۔ وہ

www.pakistanipoint.com

میرے کزن ہیں۔"

شہابی حیدر کا نام سن کر عبدالرحیم کے چہرے پر تشکر کے تاثرات پھیل گئے۔ وہ آنکھوں میں نمی بھر کر بولا۔

"شہابی صاحب کو اللہ نے ہمارے لیے رحمت کا فرشتہ بنا کر بھیجا، ورنہ طاقتوروں کے سامنے ہم کمزوروں کی کون سنتا ہے۔ دیکھوناں اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو اتنی بڑی بڑی گاڑیاں دے کر سڑکوں پر بھیج دیتے ہیں، دوسروں کے بچوں کو مارنے اور اپاہج کرنے کے لیے۔"

"آپ کا بچہ اب کیسا ہے؟" آنیہ نے دوبارہ پوچھا۔

"ایک آپریشن ہو چکا ہے، ایک ابھی ہونا ہے۔ علاج معالجے پر روپیا آج کل پانی کی طرح بہہ جاتا ہے اگر شہابی صاحب کی کوشش سے یہ تیس ہزار نہ ملتا تو کہاں سے اتنا خرچہ کرتا میں۔"

آنیہ ذرا چونکی۔ "تیس ہزار؟"

"ہاں بیٹی، شاید شہابی صاحب نے آپ کو بتایا نہیں۔ انہوں نے پورے تیس ہزار نکلوائے ہیں مہندر ناتھ سے، علاج معالجے کے لیے......"

آنیہ چپ سی ہوگئی۔ شہابی حیدر نے اسے خود بتایا تھا کہ مہندر ناتھ نے بچے کے علاج کے لیے ستر ہزار کا چیک دیا ہے۔ اس نے یہ چیک دکھایا بھی تھا۔

کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی بات کر کے آنیہ نے عبدالرحیم سے اجازت چاہی۔ وہ عجیب سی الجھن میں مبتلا ہو گئی تھی۔ فورٹ میں جا کر برش اور رنگوں سے کھیلتے ہوئے بھی اس کا دھیان عبدالرحیم سے ہونے والی گفتگو کی طرف ہی لگا رہا۔ سہ پہر سے ذرا پہلے شہابی فورٹ میں آیا۔ آج اس کا کیمرا مین بھی ہمراہ آیا تھا تاہم وہ اسے فورٹ سے باہر ہی چھوڑ آیا تھا۔

آنیہ نے شہابی سے اس اتفاقیہ ملاقات کا ذکر کیا جو آج عبدالرحیم سے ہوئی تھی۔ جب آنیہ نے وہ تیس ہزار والی بات بتائی تو شہابی حیدر واضح طور پر چونکا۔ آنیہ نے اس کے چہرے پر ایک رنگ سا گزرتے دیکھا۔ بہرحال وہ فوراً سنبھل کر بولا۔ "ہاں، عبدالرحیم کو تیس ہی مل سکا ہے، کک...... کچھ اور اخراجات بھی تھے۔"

"اور اخراجات؟"

"بھئی، وہ جس اسٹیشن ویگن کا نقصان ہوا اس کا مالک بھی تو پارٹی تھا۔ کچھ اس کو دینے پڑے، موقع پر موجود ٹریفک سارجنٹ کا بھی کچھ حصہ تھا۔ ایسے معاملے اسی طرح سے نمٹتے ہیں۔"

آنیہ نے مزید سوال جواب مناسب نہیں سمجھے مگر اس کی اُلجھن رفع ہونے کے بجائے بڑھ گئی تھی۔ شہابی اسٹیشن ویگن کے مالک کا ذکر کر رہا تھا مگر وہ بھلا مانس سا شخص تھا۔ تصفیہ ہونے سے پہلے ہی وہ تاسف میں سر ہلاتا ہوا اور بڑبڑاتا ہوا وہاں سے چلا گیا تھا۔ آنیہ نے اسے خود جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ باقی رہی ٹریفک سارجنٹ کی بات تو اس کا منہ بھی ڈیڑھ دو ہزار سے بہ آسانی بند ہو سکتا تھا۔ اصل بات آنیہ کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ شہابی حیدر کوئی نچلے درجے کا شخص نہیں تھا۔ ایک بلند و بالا شخصیت کا مالک تھا۔ اس کے حوالے سے کوئی منفی سوچ رکھنا بھی آنیہ کو گناہ کی طرح لگ رہا تھا۔

شہابی کی آواز نے اُسے خیالوں سے چونکایا۔ "کس سوچ میں کھو گئیں آپ...... شاید حساب کتاب جوڑنے لگ گئی ہیں۔"

"نن...... نہیں...... میں تو یونہی سوچ رہی تھی، اُس بچے کے بارے میں......"

"اس کا علاج بڑی سہولت سے ہو رہا ہے آنیہ...... میں نے پوری خبر رکھی ہوئی ہے۔"

فون پر کال کے سگنل آئے اور شہابی کو بات ادھوری چھوڑنا پڑی۔ دوسری طرف شہابی کا کزن نما دوست راسو ہی تھا۔ شہابی اس سے بات کرتا ہوا تھوڑے سے فاصلے پر چلا گیا۔ کوئی پریشان کن بات ہی رہی ہوگی جس کے سبب شہابی کے لب و لہجے میں کچھ تناؤ محسوس ہونے لگا۔ گفتگو کا بس کوئی کوئی لفظ ہی آنیہ کے کانوں تک پہنچ رہا تھا۔ ان میں ایک لفظ سدرہ بھی تھا۔ آنیہ کی معلومات کے مطابق سدرہ اسی گم صم لڑکی کا نام تھا جس کی ایک ٹانگ میں نقص تھا اور جسے آنیہ نے دو مرتبہ زباب منزل یعنی شہاب کی رہائش گاہ پر دیکھا تھا۔ پتا نہیں کہ اس لڑکی کا کیا معما تھا؟

شہابی حیدر جلدی میں آیا تھا اور فون سننے کے بعد جلدی میں ہی واپس چلا گیا۔ اس نے شام کو پھر ملنے کا کہا تھا۔ اس کے جانے کے بعد آنیہ گم صم سی ایزل کے سامنے رکھے اسٹول پر بیٹھ گئی۔ پتا نہیں یہ بندہ کیوں ہر وقت شہابی سے چمٹا رہتا تھا۔ کہتے ہیں کہ انسان اپنے دوستوں سے پہچانا جاتا ہے...... تو پھر...... یہ راسو، شہابی کا دوست کیوں تھا؟ آنیہ کی اُلجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ آج اس نے وڈیو لنک کے ذریعے شہابی کی ملاقات پاپا سے کرانی تھی۔ نہ جانے کیوں اس کا دل چاہا کہ وہ اس ملاقات کو دو چار دن آگے کر دے۔

وڈیو لنک پر ملاقات کا وقت شام آٹھ بجے کا تھا۔ آنیہ

www.pakistanipoint.com

کے پاپا اس وقت اپنی لاء فرم کے آفس سے فارغ ہو جاتے تھے۔ بہرحال آنیہ کے لیے اچھا ہی ہوا کہ سات بجے کے لگ بھگ آنیہ کو شہابی کا فون آ گیا۔ اس نے کہا۔ ''آنیہ ڈیئر! معذرت چاہتا ہوں ایک ضروری کام میں پھنس گیا ہوں، آج تو آپ کے پاپا سے ملاقات نہیں ہو سکے گی۔''

''چلیں، کوئی بات نہیں، پھر کسی دن کا رکھ لیتے ہیں۔'' آنیہ نے رسان سے جواب دیا۔

رات کو کھانے کے بعد دلبر ماموں تو ایک پاکستانی اسٹیج ڈراما دیکھنے میں مصروف ہو گئے۔ آنیہ اور نہار کور نے ملازم خیرو سے زبردست قسم کی ادرک والی چائے بنوائی اور ٹیرس میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں۔ آنیہ کچھ بھی نہار سے چھپاتی نہیں تھی جو ہلچل سی اس کے اندر مچی ہوئی تھی، وہ سب اس نے نہار پر آشکار کر دی۔ ایک طرح سے نہار بھی شہابی حیدر اور اس کے ماضی کی پرستار تھی۔ اسے بھی یہ ساری بات سن کر شاک لگا۔ کچھ دیر خیالوں میں کھوئے رہنے کے بعد بولی۔ ''آنیہ جانی! اکثر جو کچھ نظر آ رہا ہوتا ہے، وہ ہوتا نہیں ہے۔ شہابی حیدر جیسے شخص سے ایسی توقع نہیں کی جا سکتی...... ہرگز نہیں۔''

''مگر نہار! یہ سب کچھ ہوتا تو ہے ناں...... زرد صحافت بھی ہمارے اردگرد موجود ہے۔ میڈیا کے کچھ لوگ خبر تیار کر لیتے ہیں...... فوٹیج وغیرہ بنا لیتے ہیں پھر ملوث لوگوں سے پوچھا جاتا ہے کہ خبر آن ایئر کروانی ہے یا معاملہ رفع دفع کروانا ہے؟''

''آنیہ! تم کیسی بات کر رہی ہو، ہم شہابی حیدر کے بارے میں ایسا سوچ بھی کب سکتے ہیں......''

''نہیں نہار، میں تو ایک جنرل بات کر رہی ہوں۔ شہابی کے ماضی اور اس کے آباؤ اجداد کو دیکھا جائے تو اس کے بارے میں کچھ غلط سوچنا حماقت لگتا ہے۔''

''حماقت بلکہ اپرادھ۔'' نہار نے کہا پھر کچھ دیر پُرسوچ انداز میں خاموش رہ کر بولی۔ ''بس ایک بات ہے جو تمہاری طرح مجھے بھی اُلجھن میں رکھتی ہے۔ یہ راسو...... شہابی کے اتنا قریب کیوں ہے...... اور...... پھر وہ ٹانگ سے معذور لڑکی سدرہ؟ جس کے بارے میں شہابی نے بتایا تھا کہ اسے راسو نے اس کے گھر رکھا ہوا ہے، تم نے کبھی پوچھا نہیں شہابی سے اس لڑکی کے بارے میں؟''

''بس ایک روز تھوڑی سی بات ہوئی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ راسو کے ایک قریبی فرینڈ کی بیوہ ہے، بالکل بے سہارا ہے۔''

''اور ٹانگ؟''

''سیڑھیوں سے گر کر زخمی ہوئی تھی۔''

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتی، دلبر ماموں دندناتے ہوئے اندر آ گئے۔ گلاب جامن اور موتی چور کے لڈو ان کی کمزوری تھے اور خاص طور سے لڈو، کوئی ایک درجن تازہ بہ تازہ لڈو انہوں نے اسٹیل کے تھال میں ڈال رکھے تھے، بولے۔ ''لو دھی رانیو! کھاؤ اور میرے سامنے کھاؤ''

''آپ کے سامنے کیوں ماما جی؟'' نہار نے استفسار کیا۔

''میں تو کھا نہیں سکدا، پر جب تم کھاؤ گی تو مجھ کو وہی مزہ آئے گا۔''

نہار بلند آواز میں ہنسی۔ ''آپ کو تو مزہ آ جائے گا پر یہ لڈو ہمیں ہضم نہیں ہوں گے۔''

''اوئے کچھ نہیں ہوندا بے وقوفے، ماں پیو دی نظر بچوں کے کھانے کو نہیں لگدی۔'' انہوں نے کہا اور بڑی محبت سے ایک ایک لڈو آنیہ اور نہار کے منہ میں ٹھونس دیا۔

اگلے روز جمعہ تھا۔ دوپہر کے بعد آنیہ نے شہابی کے ساتھ آؤٹنگ کے لیے جانا تھا۔ یہ شہابی ہی کا پروگرام تھا۔ وہ اسے ایک قریبی جھیل دکھانا چاہتا تھا۔ آنیہ نے دلبر ماموں سے اجازت لے لی تھی مگر دو بجے کے قریب شہابی کا فون آیا، وہ بولا۔ ''راسو بھی ساتھ جانا چاہ رہا ہے کیوں ناں اس کو ''گروپ ٹور'' بنا لیں۔ آپ نہار کو بھی ساتھ لے لو۔''

راسو کا نام سن کر آنیہ چڑ گئی۔ اس نے کہا۔ ''پلیز شہابی! اگر آپ نے پہلے والا پروگرام رکھنا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ میں نہیں جا رہی۔''

''اوہو، تم تو ناراض ہو گئیں۔ چلو ٹھیک ہے، میں اسے ہینڈل کر لیتا ہوں۔''

آنیہ نے کچھ کہنا چاہا تو وہ جلدی سے بولا۔ ''اوکے...... اوکے...... تم بس تیار ہو جاؤ میں دس پندرہ منٹ میں لینے آ رہا ہوں۔'' اس نے 'بائے' کہہ کر فون بند کر دیا۔

یہ بھی ایک چمکیلی اور خوشگوار دوپہر تھی۔ بلندیوں سے چلنے والی ہوا میں سفیدے اور پاپلر کے درخت جھوم رہے تھے۔ اس ہوا میں نباتات کی مہک کے علاوہ ایک جدا طرح کی خوشبو تھی۔ شہابی گاڑی میں سینڈوچ، کافی اور فروٹ وغیرہ بھی رکھ لایا تھا۔ اس کے ذہن میں پکنک کا سا ماحول تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح نفیس لباس میں تھا۔ پرفیسی کے اسپرے نے اسے مہکا رکھا تھا۔ تاہم اس مہک کے اندر سے ایک ''چغلی'' سی بھی پھوٹی محسوس ہوتی تھی۔ یہ اسموکنگ کی طرف اشارہ کرتی تھی۔ آنیہ جان چکی تھی کہ شہابی کبھی کبھی

www.pakistanipoint.com

اسموکنگ کرتا ہے۔ اسے یقین سا تھا کہ یہ بدعادت اسے راسو سے ہی پڑی ہوگی۔

ابھی وہ ٹاؤن سے کچھ ہی دور گئے تھے کہ ایک فون کال نے انہیں ڈسٹرب کردیا۔ کوئی اروڑا صاحب تھے جو شہابی کو فوری طور پر بلا رہے تھے۔ شہابی نے ٹالنے کی کوشش کی مگر نہ صرف ناکام ہوا بلکہ مزید پریشان بھی۔ غالباً دوسری طرف سے ذرا سخت لہجے میں بات کی گئی تھی۔

''اوکے آرہا ہوں۔'' شہابی نے کہا اور کال منقطع کردی۔

''کون ہے؟'' آنیہ نے پوچھا۔

''بس ہے ایک مصیبت، پندرہ بیس منٹ اب ضائع ہونے ہی ہونے ہیں، چلو کوئی بات نہیں۔''

اس نے گاڑی کو یوٹرن دیا اور ایک ذیلی سڑک پر مڑ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں ایک شاندار ہاؤسنگ سوسائٹی کی حدود میں داخل ہورہے تھے۔ یقیناً نئی سوسائٹی تھی۔ بہت سے پلاٹ ابھی خالی پڑے تھے۔ سوسائٹی کا وسیع وعریض آفس بھی زبردست تھا۔ پارکنگ اور سیکیورٹی وغیرہ کا ہائی فائی انتظام تھا۔ شہابی نے آنیہ کو آفس کی ائرکنڈیشنڈ انتظارگاہ میں بٹھایا اور اس سے بیس پچیس منٹ کی اجازت لے کر اندرونی حصے میں چلا گیا۔ وہ ڈسٹرب نظر آرہا تھا۔ انتظارگاہ میں اور بھی خواتین وحضرات موجود تھے۔ اندر جانے کے لیے آئی ڈی کارڈ اور موبائل فون وغیرہ جمع کرانا پڑتا تھا۔ اس کے بعد سیکیورٹی کے مختلف مراحل سے گزرنا پڑتا تھا۔

آنیہ نے پندرہ بیس منٹ انتظار کیا پھر اس کے اندر کھدبدسی ہونے لگی۔ شہابی کو یہاں اچانک کیا کام پڑ گیا تھا؟ جستجو بڑھی تو وہ جیسے ان دفاتر کی سیر کے لیے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ آئی ڈی کارڈ اور موبائل وغیرہ جمع کرا کر وہ اندر چلی گئی۔ یہاں صاف شفاف خاموش راہداریاں تھیں، کاؤنٹرز تھے، آراستہ انتظارگاہیں تھیں۔ آنیہ نے شہابی کو شیشے کی ایک دیوار کے پیچھے اوجھل ہوتے دیکھا تھا۔ یہ دفاتر کا اندرونی پورشن تھا۔ وہ اس طرف گئی تو اسے روکا گیا۔ اس نے کہا کہ وہ گیس اپلی کیشن کا اسٹیٹس جاننا چاہ رہی ہے۔ گارڈز نے اسے جانے دیا مگر وہ گیس ڈپارٹمنٹ کی طرف جانے کے بجائے بائیں جانب ایک خاموش کوریڈور میں مڑگئی۔ کچھ آوازوں نے اس کے قدم جکڑ لیے۔ یہ آوازیں شیشے کی دیواروں والے ایک اپارٹمنٹ کے اندر سے آرہی تھیں اور ان میں شہابی کی آواز بھی نمایاں تھی۔ یہ سوسائٹی کے کسی خاص الخاص عہدیدار کا آفس تھا۔ اندر پردے تھے۔ ایک جھری میں سے آنیہ نے ڈرتے ڈرتے جھانکا اور بے طرح چونک گئی۔ ایک نہایت بیش قیمت آفس ٹیبل کے پیچھے ایک درمیانی عمر کا بارعب شخص تھری پیس سوٹ پہنے بیٹھا تھا۔ اس کے عقب میں ایک خوب صورت لڑکی فائل تھامے کھڑی تھی اور ایک مؤدب، مسلح گارڈ موجود تھا۔ بارعب شخص کی اوپر کو اٹھی ہوئی گھنی مونچھیں، سرخ آنکھیں اور جبڑوں کا ابھرا ہوا گوشت اس کی سخت گیری کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ زیادہ حیرانی کی بات یہ تھی کہ شہابی حیدر اس کے سامنے چپ چاپ کھڑا تھا۔ شہابی کی آواز آنیہ کی سماعت سے ٹکرائی۔ ''اروڑا صاحب! لڑکی بالغ ہے۔ باقاعدہ اس کی کلائیوں کے ٹیسٹ ہوئے ہیں۔ ساری رپورٹس موجود ہیں۔ آپ جانتے ہیں کورٹ میں نکاح ہوا ہے اور......''

''مجھے قانون مت پڑھاؤ۔'' بارعب شخص گرجا۔ ''اور...... یہ کھڑے کیسے ہوتم؟ اپنے ہاتھ باہر نکالو پتلون کی جیبوں سے...... باہر نکالو۔''

شہابی حیدر کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ ''سوری۔'' اس نے کہا اور ہاتھ پینٹ کی جیبوں سے باہر نکال لیے۔

جس شخص کا نام اروڑا لیا گیا تھا، وہ ٹیبل کے پیچھے سے نکل کر شہابی کے سامنے آیا۔ اس نے شہابی کی طرف انگلی اٹھائی اور ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔ ''دیکھ شہابی! تیرا واسطہ پڑ گیا ہے کرنل اروڑا سے...... ساری صحافت تیری ناک کے راستے سے خارج ہوجائے گی اور وہ جو حرامی ایم پی اے تیرا یار ہے ناں اس کی پتلون گیلی ہونے میں بھی دیر نہیں لگے گی...... چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اس لڑکی اور لڑکے کو ٹھیکیدار کے حوالے کردو...... اور چوبیس گھنٹے کا مطلب چوبیس گھنٹے ہی ہوتا ہے۔''

''پپ...... پر اروڑا صاحب! یہ میرے لیے عزت بے عزتی کا معاملہ بن چکا ہے، اگر آپ......''

''اوئے بھاڑ میں جائے تیری عزت۔ جب چینل والے تیری تشریف پر لات مار کر تجھے نوکری سے نکالیں گے تو اس وقت تیری عزت بچ جائے گی؟ اور جب حبس بے جا اور اغوا کا کیس ٹھوکوں گا تیرے اوپر تو پھر کس کی ماتا کو ماسی کہہ کر بلائے گا؟ بتا کس باسٹرڈ کے چرنوں میں گرے گا؟''

آنیہ دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ شہابی حیدر کا رنگ زرد تھا اور پیشانی پر پسینا چمک رہا تھا۔ اروڑا کچھ دیر اسے قہرآلود نظروں سے گھورتا رہا، پھر اس نے رومال نکال کر شہابی کی پیشانی تھپتھپائی اور بدلے ہوئے نرم لہجے میں بولا۔ ''بہتر یہی ہے کہ اس پرائے پنگے میں سے اپنی ٹانگ نکال لے۔

www.pakistanipoint.com

خود بھی سکون میں آجا اور دوسروں کو بھی شانتی سے چلنے دے۔ ہم دشمنوں کے دشمن ہیں تو یاروں کے یار بھی ہیں......''

پاس ہی کھٹ پٹ ہوئی۔ آنیہ جلدی سے پیچھے ہٹ گئی اور ایک دیوار گیر شیشے سے باہر اِن ڈور باغیچے کی طرف دیکھنے لگی۔ دو باوردی ملازم فائلوں کے ایک پلندے کے ساتھ کسی اندرونی حصے کی طرف چلے گئے۔

اندر کی مدھم آوازیں اب بھی آنیہ تک پہنچ رہی تھیں۔ اسے اپنی سماعت پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ شہابی حیدر کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ اب وہ مصالحت کی بات کر رہا تھا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ جس شخص کا نام کرنل اروڑا ہے، وہ شہابی کو بُری طرح دھمکانے کے بعد اب شاید اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہا ہے۔

شہابی کی مری مری آواز آنیہ کے کانوں میں جیسے سیسہ پگھلا گئی۔ ''اگر کوئی سخت بات کہہ دی ہو تو معافی چاہتا ہوں اروڑا صاحب! آپ کی بات ٹال نہیں سکتا......''

وہ بولتا رہا۔ آنیہ وہاں سے ہٹ گئی اور بے جان قدموں سے چلتی ہوئی واپس ''مین سٹنگ ایریا'' کی طرف چلی گئی۔ اس نے کیا دیکھ اور سن لیا تھا؟ اسے لگ رہا تھا کہ اس نے اپنے تصور کے کینوس پر پچھلے کئی برسوں میں جو ایک پُرشکوہ پینٹنگ بنائی تھی وہ یکایک اپنے سارے رنگوں سے محروم ہو گئی ہے۔ حقیقت کی تند بارش نے اسے سارے کا سارا دھو ڈالا ہے......یکسر بیکار کر دیا ہے۔

وہ جھیل دیکھنے نہیں گئے...... وہ کہیں بھی نہیں گئے۔ آنیہ نے شدید سر درد کا بہانہ بنایا۔ شہابی حیدر نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ بھی اب تفریحی موڈ میں نہیں ہے۔ آنیہ کو دلبر ماموں کے گھر چھوڑنے کے بعد اس نے کل ملنے کا وعدہ کیا اور چلا گیا۔

رات کو آنیہ نے سب کچھ نہار کے گوش گزار کر دیا۔ وہ دونوں کتنی ہی دیر تک سکتہ زدہ بیٹھی رہیں۔ جب تصورات کے عالیشان بت ٹوٹتے ہیں تو بڑی تکلیف ہوتی ہے...... یہ سب کیا ہو رہا تھا؟ نہار نے بتایا کہ وہ اس آکاش اروڑا کے بارے میں تھوڑا بہت جانتی ہے۔ اس نے کہا۔ ''یہ دو سال پہلے ہی انڈین آرمی سے ریٹائر ہوا ہے۔ اب اپنے بھائی کا نام استعمال کرتے ہوئے اس نے یہاں راجوری میں یہ بڑی ہاؤسنگ اسکیم بنائی ہے۔ اثر و رسوخ والا طاقتور بندہ ہے۔ وزیر امیر اسے سلام کرنے آتے ہیں۔''

''تو اب کیا ہوگا؟'' آنیہ نے عجیب کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ ''شہابی حیدر اس لڑکے اور لڑکی کو ٹھیکیدار کے حوالے کر دے گا؟''

''بظاہر تو یہی لگ رہا ہے لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی درمیانی راہ نکل آئے۔''

آنیہ نے بیزاری کے عالم میں سر کو دائیں بائیں ہلایا، پھر کہنے لگی۔ ''نہار! ہم کل واپس جالندھر جا رہے ہیں۔''

نہار ٹھٹک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ایک توقف کے بعد بولی۔ ''آنیہ جانی! اتنی جلدی کسی کے بارے میں کوئی نتیجہ نہیں نکال لینا چاہیے۔ میں سچ کہہ رہی ہوں، مجھے اب بھی وشواش نہیں ہو رہا کہ جلیانوالا باغ کے کرداروں سے شروع ہونے والی کتھا اس طرح ختم ہو سکتی ہے۔ ہم ٹھیک جگہ پر پہنچے ہیں۔ اصل وارث سے ملے ہیں۔ شہابی حیدر میں اس تاریخی تصویر والی ساری جھلکیاں موجود ہیں اور......''

''خاک موجود ہیں۔'' آنیہ نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ''میں جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی ہوں، اس نے ساری فینٹسی اور ساری خوش فہمیوں کے بخیے اُدھیڑ دیے ہیں۔''

نہار اسے سمجھانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کی رائے تھی کہ آنیہ کو ذرا دھیرج سے کام لینا چاہیے۔

☆☆☆

چوبیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ آنیہ کا شہابی سے کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ اس کا فون مسلسل بند جا رہا تھا۔ آنیہ اور نہار کو اس جوڑے کی طرف سے بھی پریشانی تھی جسے شہابی نے پہلے اپنے گھر میں اور پھر کسی دوست ایم پی اے کے پاس پناہ دی تھی۔ جو کچھ آنیہ نے ہاؤسنگ سوسائٹی کے دفتر میں سنا تھا، اس کے بعد اسے یقین سا ہو گیا تھا کہ اس لڑکے لڑکی کی اب خیر نہیں۔ مغرب کے بعد آنیہ نے ایک بار پھر شہابی سے بات کرنے کی کوشش کی۔ فون یا تو اٹینڈ نہیں ہوتا تھا یا بند ملتا تھا۔ پچھلے دس بارہ گھنٹے سے وہ مسلسل بند تھا۔ آنیہ جھنجلا سی گئی۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ شہابی کی اور اس جوڑے کی موجودہ صورتِ حال جان کر ہی رہے گی۔ آنیہ اور نہار نے مشورہ کیا۔ دلبر ماموں شام کے بعد انہیں گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ شہر کے عمومی حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ فیصلہ ہوا کہ نہار گھر میں ہی رہے گی اور کمرے کو اندر سے بند کر کے لائٹ آف کر دے گی۔ دلبر ماموں آئے تو یہی سمجھیں گے کہ دونوں لڑکیاں جلدی سو گئی ہیں۔

نو بجے کے قریب آنیہ خاموشی سے نکلی اور ایک رکشا پکڑ کر سیدھی زباب منزل شہابی کے گھر جا پہنچی۔ زباب منزل کی کچھ کھڑکیاں روشن اور کچھ تاریک نظر آرہی تھیں۔ تاہم زیادہ تر گارڈن لائٹس آن تھیں۔ آنیہ کو امید تھی کہ یہاں وہ شہابی سے مل سکے گی اور اس سے پوچھ سکے گی کہ وہ اپنا فون بند کیے کیوں بیٹھا ہے؟ وہ اس ڈرے سہمے جوڑے کے انجام کے بارے میں بھی شہابی سے جاننا چاہتی تھی اور اگر ان کے بچاؤ کے سلسلے میں کچھ ہوسکتا تو کرنا چاہتی تھی۔ اس نے کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ دروازہ کھولنے والا وہ شخص ہوگا جسے وہ ہرگز دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ بڑھی ہوئی شیو اور بکھرے بالوں والا راسو تھا۔

''زہے نصیب...... آپ ہمارے غریب خانے پر تشریف لائیں، آجائیے...... آجائیے۔'' وہ ایک طرف ہٹتے ہوئے بولا۔

''شہابی کہاں ہیں؟''

''سب یہیں ہیں، آپ اندر تو تشریف لائیں۔'' اس نے کہا۔

آنیہ جھجکتی ہوئی اندر چلی گئی۔ راسو نے گیٹ کا چھوٹا دروازہ بند کیا۔ دونوں گراسی لان کے درمیان والی روش پر چلتے ہوئے اندرونی حصے میں آگئے۔ آنیہ کو کچھ خاموشی سی محسوس ہوئی۔

''زباب بیگم اور آیا خالہ کہاں ہیں؟''

''بھئی سب یہیں ہیں، آپ ڈر کیوں رہی ہیں؟'' اس نے بڑے اعتماد سے کہا اور آنیہ کو اندر لے آیا۔

آنیہ کی چھٹی حس نے اسے خطرے کا احساس دلایا۔ گیراج کی جانب کوئی گاڑی بھی نظر نہیں آئی تھی۔ گھر میں عجیب سی خاموشی تھی۔ راسم عرف راسو رہائشی حصے کا داخلی دروازہ بند کر چکا تھا۔ کسی قریبی کمرے سے ٹی وی چلنے کی آواز آرہی تھی۔ وہ لیونگ روم کے صوفوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ گھبرائیے نہیں...... بیٹھیے...... میں آپ کو ساری بات بتاتا ہوں۔''

آنیہ کا دل شدت سے دھڑکنے لگا تھا۔ وہ ایک صوفے کے کنارے پر بیٹھ گئی۔ راسو بظاہر شائستہ لہجے میں بولا۔ ''سدرہ کی متاثرہ ٹانگ میں پانچ چھ روز سے شدید درد ہے۔ وہ اسپتال میں ایڈمٹ ہے۔ امی (آیا خالہ) اس کے پاس ہیں۔''

''اور باقی لوگ؟'' آنیہ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''وہ سب ایک شادی پر ہوشیار پور گئے ہوئے ہیں۔ شاید کل رات تک لوٹیں گے۔''

آنیہ ایک دم کھڑی ہوگئی۔ ''اچھا...... تو میں...... چلتی ہوں۔''

''او ہو بھئی...... چلی جائیے گا لیکن جس کام سے آئی ہیں، وہ تو کرتی جائیے...... شہابی سے تو مل لیں۔'' اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''لیکن آپ تو کہتے ہیں کہ گھر میں کوئی اور نہیں؟''

''تو فون پر بات کرلیں۔''

''اُف...... فون تو اُن کا بند ہے۔''

''مجھے پتا ہے کہ اس کا فون بند ہے...... اور شاید اسی لیے آپ کو چل کر یہاں آنا پڑا ہے۔'' وہ عجیب انداز سے مسکرایا۔ اس کے دیکھنے کا انداز آنیہ کو کبھی بھی اچھا نہیں لگا تھا اور آج تو بالکل بھی نہیں لگ رہا تھا۔ وہی برمے کی طرح اندر تک گھستی ہوئی نگاہیں جن میں ایک طرح کی حسرت سی شامل رہتی تھی۔

آنیہ نے دروازے کی طرف قدم بڑھانا چاہا تو راسو نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا۔ ''آپ گھبرائیں نہیں، دو منٹ بیٹھ جائیں۔ میں شہابی سے آپ کی بات کرا دیتا ہوں۔ اس کا ایک دوسرا نمبر بھی ہے اور وہ کھلا ہے۔''

اس نے اپنی جین کی جیب میں سے اپنا موبائل فون نکالا۔ اس پر ایک نمبر پریس کیا، چند سیکنڈ بعد بولا۔ ''ہیلو شہابی! تمہاری ایک بہت بڑی فین تم سے ملنے کے لیے آئی ہوئی ہیں لو ان سے بات کرو۔ بہت پریشان ہیں۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے فون آنیہ کی طرف بڑھا دیا۔

''ہیلو شہابی! کہاں ہیں آپ...... کوئی ایک سو کالز تو کی ہوں گی میں نے۔''

''دراصل ایک مسئلے میں پھنس گیا تھا اس لیے دوسرا فون بند کرنا پڑا۔'' شہابی نے کہا۔

آنیہ نے ایک توقف کے بعد پوچھا۔ ''کہیں یہ وہ...... اسی لڑکے ظہیر...... اور لڑکی نادیہ والا مسئلہ تو نہیں؟''

دوسری طرف چند لمحوں کے لیے سناٹا سا چھا گیا پھر شہابی نے پوچھا۔ ''تم یہ کیوں کہہ رہی ہو؟''

''دراصل آج نہار کور کو کہیں سے پتا چلا ہے کہ راجوری کا کوئی ریٹائرڈ فوجی افسر اس لڑکی نادیہ کی واپسی کے لیے سخت پریشر ڈال رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس لڑکی کو زبردستی اس کے وارثوں کے حوالے کردیا جائے۔''

''نہار کو یہ سب کس نے بتایا؟''

www.pakistanipoint.com

''بس کسی طرح پتا چل گیا اُسے۔ ابھی میں نے زیادہ تفصیل نہیں پوچھی۔'' آنیہ نے بات بنائی۔

''تو تم صرف اُس لڑکی کے بارے میں جاننے کے لیے یہاں زباب منزل چلی آئی ہو؟''

''نہیں شہابی! میں آپ کے لیے بھی پریشان تھی۔ مجھے آپ کی کچھ سمجھ نہیں آ رہی ہے۔''

شہابی اور آنیہ کے درمیان تین چار منٹ گفتگو ہوئی۔ اس دوران میں دراز قد راسو اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے خاموش کھڑا رہا۔ شہابی حیدر نے تسلیم کیا کہ وہ جس مسئلے کا ذکر کر رہا تھا، وہ ظہیر اور نادیہ سے ہی متعلق ہے۔

''تو اب کہاں ہیں وہ؟'' آخر میں آنیہ نے پوچھا۔ وہ شہابی کے لیے اپنی ناپسندیدگی بمشکل چھپا پا رہی تھی۔

''انہیں نکال دیا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''بس...... سمجھو کہ وہ اب ایم پی اے کے پاس نہیں ہیں۔ انہیں محفوظ جگہ پہنچا دیا ہے۔ باقی میں ایسی جگہ ہوں جہاں زیادہ لمبی بات نہیں کر سکتا۔ کل میں خود تم سے بات کر کے تفصیل بتاؤں گا۔ تم ذرا جلدی سے راسو کو فون دو...... بس ایک منٹ کے لیے...... ذرا جلدی کرو پلیز......''

آنیہ نے شہابی کی عجلت محسوس کرتے ہوئے بیزاری کے ساتھ فون راسو کی طرف بڑھا دیا۔ وہ شہابی سے سرگوشیوں کے انداز میں بات کرتا ہوا آٹھ دس قدم دور چلا گیا۔ راسو کے انداز سے ظاہر تھا کہ دونوں دوستوں میں تلخ کلامی ہو رہی ہے۔

آنیہ اب جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ وہ دروازے کی جانب بڑھی تو راسو فون بند کر کے پھر اس کے سامنے آ گیا۔ ''یہ نہیں ہو سکتا مس آنیہ! آپ کچھ کھائے پیے بغیر یہاں سے نہیں جا سکتیں۔ یہ زباب منزل کی روایت نہیں ہے۔ پلیز بیٹھیں۔''

''نہیں مجھے فوراً جانا ہے، میں ماموں کو بتائے بغیر آ گئی ہوں۔'' وہ ذرا سختی سے بولی اور پھر بند دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔

اس بار راسو نے اس کی کلائی تھام لی۔ کھلے گریبان سے اس کے سینے کے گھنے سیاہ بال جھانک رہے تھے اور وہی سگریٹ نوشی کی بو باس، وہ مسکرا کر بولا۔ ''مہمان آتا اپنی مرضی سے ہے مگر جاتا میزبان کی مرضی سے ہے۔ آپ کے ساتھ تھوڑی دیر بیٹھنا...... ایک کپ کافی کا پینا میرے لیے بڑی خوشی کی بات ہوگی۔''

اپنی کلائی پر راسو کا لمس آنیہ کو کسی انگارے کی طرح محسوس ہوا۔ ''چھوڑیں مجھے۔'' وہ طیش سے بولی اور اپنی کلائی چھڑانے کے لیے زور لگایا۔ اس کوشش میں اس کے ہاتھ کی پشت بڑے زور سے راسو کے چہرے سے ٹکرائی۔ یوں لگا جیسے اس نے الٹے ہاتھ کا تھپڑ راسو کے منہ پر دے مارا ہو۔ دو سیکنڈ میں راسو کے بالائی ہونٹ سے خون رس آیا۔

''جانور نہیں ہوں کہ تمہیں پھاڑ کھاؤں گا۔'' راسو پھنکارا اور اس کی کلائی کو زور سے آگے پیچھے ہلایا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے لگا کہ وہ بھی اسے کوئی چوٹ لگا دے گا مگر پھر اس نے خود کو سنبھالا۔ اپنی بائیں آستین سے وہ خون پونچھا جو ہونٹ سے رس آیا تھا۔ تب نسبتاً ٹھہرے ہوئے ہلکے پھلکے لہجے میں بولا۔ ''پہلے تو صرف درخواست تھی لیکن اب تمہیں ''کچھ وقت'' میرے ساتھ گزارنا ہی پڑے گا۔'' آنیہ کی کلائی پر اس کی گرفت سخت تھی۔

اُسے لگا کہ وہ ایک جال میں آ پھنسی ہے۔ زباب منزل خالی پڑی تھی۔ دروازے بند تھے۔ وہ ملتجی لہجے میں بولی۔ ''میں سوری بولتی ہوں، میں نے جان کے نہیں مارا، پلیز مجھے جانے دو۔''

وہ مسکرایا۔ ''شاید تم ''وقت گزارنے'' والی بات سے ڈر گئی ہو۔ کوئی غلط مطلب مت لو۔ بس ایک ساتھ بیٹھیں گے، کافی پئیں گے۔ تھوڑی سی باتیں کریں گے...... پھر میں تمہیں خود باہر تک چھوڑ کر آؤں گا۔ بڑے دنوں سے حسرت تھی کہ کہیں اکیلے میں تمہارے ساتھ بیٹھوں۔ تمہیں بڑے اطمینان سے دیکھوں اور سمجھنے کی کوشش کروں کہ تمہارا چہرہ کیوں اتنا جانا پہچانا سا لگتا ہے۔''

آنیہ کو اس کی باتوں سے ڈر لگنے لگا۔ اُس کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔

''آ جاؤ ناں پلیز...... یہاں کھڑکی کے پاس بیٹھتے ہیں۔ لان کی ساری پھلواری، فوارے اور روشنیاں نظر آ رہی ہیں، میں تمہارے لیے کافی بناتا ہوں۔''

اس نے پہلے ذرا آرام سے اور پھر سختی سے اُسے دیوار گیر کھڑکی کی طرف کھینچا۔ ''اُف پلیز...... مجھے درد ہو رہا ہے، میری کلائی......''

اس نے گرفت ذرا نرم کر دی اور اسے کھڑکی کے قریب رکھی خوب صورت میز کے سامنے بٹھا دیا۔ آنیہ نے سوچا کہ مزاحمت کا رویہ اس جذباتی شخص کو سختی کی طرف مائل

www.pakistanipoint.com

کرسکتا ہے۔ اس نے رسٹ واچ دیکھی اور پھر سوالیہ نظروں سے اس کا چہرہ تکنے لگی۔

"کافی کے ساتھ کیا لاؤں؟" وہ بولا۔ "شہابی نے بتایا تھا کہ تمہیں آلو کے چپس بہت پسند ہیں۔"

"اس وقت کچھ نہیں...... بلکہ...... کافی بھی نہیں۔" وہ منمنائی۔ "میں...... آدھا کپ چائے پی لوں گی۔"

وہ سامنے ہی واقع کچن میں داخل ہوگیا۔ آنیہ نے مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ مقفل تھا اور چابی آس پاس کہیں نظر نہیں آرہی تھی پھر اس کا دھیان اپنے موبائل فون کی طرف گیا۔ کیا وہ کسی طرح نہار یا ماموں دلبر کو اس ناگہانی مصیبت سے آگاہ کرسکتی تھی۔ وہ سوچ ہی رہی تھی جب راسو نے کچن کا دروازہ پورا کھول دیا۔ اب وہ اس کی کوئی بھی حرکت دیکھ سکتا تھا۔ آنیہ کی ہتھیلیاں پسینے سے تر ہوگئیں۔ وہ دل میں دعائیہ کلمات دہرانے لگی۔ زباب منزل بالکل خالی تھی۔ جو ایک دو ملازم تھے غالباً وہ بھی چھٹی پر تھے۔

کچھ ہی دیر بعد وہ چائے کے دو گرما گرم کپ اور چپس لے کر آنیہ کے سامنے میز پر بیٹھا تھا۔ آنیہ نے پلکیں جھکا رکھی تھیں اور چائے کے چھوٹے چھوٹے "سپ" زہر مار کر رہی تھی۔ وہ عجیب نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے اس کے چہرے کے ایک ایک انچ ایک ایک ملی میٹر کو اپنی آنکھوں میں جذب کرلینا چاہتا ہو۔

اچانک بولا۔ "محبت، حاصل کرلینے کا ہی نام تو نہیں۔ یہ احساس بھی تو بڑا دلنشیں ہوتا ہے کہ ہم کسی کو چاہتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں، وہ ہماری چاہت سے باخبر ہے۔"

آنیہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے گلاب کی پنکھڑیوں جیسے لب بے ساختہ کپکپا کر رہ گئے۔

"مس آنیہ! یہ میری ایک بڑی حسرت تھی جو آج پوری ہوئی ہے۔ تمہیں قریب سے دیکھنا...... بغیر کسی کی مداخلت کے تمہاری آواز سننا...... تمہاری آنکھوں کے رنگ کے اندر ڈوبنا اور اس فرحت بخش کیفیت کو محسوس کرنا کہ جالندھر سے آنے والی یہ لڑکی صرف میرے لیے میرے سامنے بیٹھی ہوئی ہے۔ میں تم سے کچھ بھی نہیں چاہتا...... اور نہ کبھی چاہوں گا۔ مجھے پتا ہے ہم دو مختلف راستوں کے راہی ہیں۔ تمہاری زندگی میں شہابی کی جو اہمیت ہے، وہ بھی میں بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں۔"

وہ خاموش رہی، اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس موقع پر کیا کہے۔ پھلواری میں پھول جھوم رہے تھے۔ بڑے فوارے کے پانی میں چاندنی کی کرنیں جھلملا رہی تھیں۔ اس نے آنیہ کے خوب صورت ہاتھ پر نرمی سے اپنا ہاتھ رکھا۔ "مجھ سے ڈر تو نہیں آرہا؟" راسو نے پوچھا۔

آنیہ نے پلکیں جھکائیں اور بے ساختہ کہہ گئیں۔ "پپ...... پہلے آرہا تھا مگر اب نہیں۔"

"میں اس ملاقات کو ہمیشہ یاد رکھوں گا...... ساری زندگی۔" اپنے آخری دو الفاظ پر وہ خود ہی ہنس دیا۔ "ساری زندگی......اور زندگی پتا نہیں کتنی ہے۔"

وہ اس سے کچھ پوچھنا چاہتی تھی مگر پھر اسے یہ سب کچھ بے فائدہ لگا۔ وہ ایک بار پھر اٹھنے کے لیے بے چین نظر آنے لگی۔ راسو نے اپنا ہاتھ عادتاً سگریٹ کے پیکٹ کے لیے اپنی جیب کی طرف بڑھایا مگر پھر آنیہ کی موجودگی کو محسوس کر کے رک گیا۔ آنیہ نے ایک نظر اس پر ڈالی۔ گارڈن لائٹ، اس کے چہرے کی ایک سائڈ کو روشن کر رہی تھی۔ ان لمحوں میں وہ اسے اتنا برا نہیں لگا جتنا لگا کرتا تھا۔ شاید وجہ یہ تھی کہ وہ اس گھر میں یکسر تنہا ہونے کے باوجود اب تک اخلاق کے دائرے میں رہا تھا۔

اس نے اپنا بایاں ہاتھ اب بھی آنیہ کے کومل ہاتھ پر رکھا ہوا تھا۔ پھر اس نے ہاتھ کو اپنی کھردری گرفت میں لے کر ہولے سے دبایا اور گہری سانس لے کر بولا۔ "یاد رکھنا کہ کوئی تمہیں چاہنے لگا تھا...... اس کی زندگی میں تمہاری بہت اہمیت ہوگئی تھی...... چلو آؤ...... تمہیں باہر تک چھوڑ آؤں۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

آنیہ کو یوں لگا جیسے مدتوں کی قیدِ تنہائی کے بعد کسی نے اس کے زنداں کا دروازہ کھول دیا ہو۔

ابھی وہ لان کی طرف آہی رہے تھے کہ آٹومیٹک رائفل کی زبردست تڑتڑ سنائی دی۔ یہ ایک لمبا برسٹ تھا جو کہیں پاس ہی چلایا گیا تھا۔ راسو بے طرح ٹھٹک گیا۔ آنیہ کو وہیں چھوڑ کر وہ تیزی سے باہر لان میں آیا۔ یہی وقت تھا، جب دوسرا برسٹ چلا۔ اب آواز کی سمت اور فاصلے کا بھی درست اندازہ ہوا۔ یہ برسٹ کم و بیش دو فرلانگ کی دوری پر چلے تھے۔ اسی دوران میں سنگل فائر بھی شروع ہو گئے۔ جیسے دو گروپ ایک دوسرے پر گولی چلا رہے ہوں۔ راسو نے جلدی سے موبائل فون نکالا اور کسی سے بات کرنے لگا۔ اس کے چہرے پر اضطراب صاف محسوس کیا جا سکتا تھا۔ تب وہ کمرے میں آکر ایک الماری کی طرف گیا اور کوئی چیز اپنی شرٹ کے نیچے چھپائی۔ آنیہ کو یہی لگا کہ وہ کوئی ہتھیار وغیرہ ہے۔ اس کے خوف میں اضافہ ہوگیا۔

اسی دوران میں راسو کے موبائل پر کال آگئی۔ ایک

www.pakistanipoint.com

بار پھر اس نے تیز سرگوشی کے لہجے میں چند فقروں کا تبادلہ کیا اور آنیہ کی طرف آیا۔

کچھ کہے بغیر اس نے آنیہ کا بازو تھاما اور لان سے گزر کر مین گیٹ کی طرف بڑھا۔ یہی وقت تھا جب کچھ ہی فاصلے پر کسی پولیس کار کا سائرن سنائی دینے لگا۔ راسو رک گیا۔

''یہ...... کیا ہو رہا ہے؟'' آنیہ نے ہراساں آواز میں قریباً چلاتے ہوئے پوچھا۔

وہ آنیہ کو دوبارہ کمرے میں لے آیا۔ چند لمحے تک باہر کی آوازوں پر غور کرتا رہا پھر مضطرب مگر ٹھہرے لہجے میں کہنے لگا۔ ''مین بازار کے بڑے چوک کے پاس کچھ گڑبڑ ہوگئی ہے۔ شاید ایک دو بندے مر بھی گئے ہیں۔ ابھی ہمارا باہر نکلنا ٹھیک نہیں۔'' اس نے دیوار گیر کھڑکی کے پٹ بند کر دیے۔ دو قریبی کمروں کی روشنیاں بجھا دیں اور ٹیبل پر رکھے ہوئے چائے کے برتن بھی کچن میں پہنچا دیے۔ آنیہ ڈری سہمی سی صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ اس فائرنگ سے راسو کا اور زباب منزل کا کیا تعلق ہو سکتا تھا؟

اب ایک دو ایمبولینس گاڑیوں کے ہوٹر بھی سنائی دینے لگے تھے۔ فضا میں سنسنی پھیلتی محسوس ہو رہی تھی۔ آنیہ نے پچھلے دنوں پہلے ہی یہ نیوز پڑھی تھی کہ راجوری میں گینگ وار کا سا ماحول بن رہا ہے۔ دو متحارب گروہ ایک دوسرے کے درپے ہو رہے ہیں، کوئی بڑا واقعہ ہو سکتا ہے۔ کہیں یہ وہی معاملہ تو نہیں؟ اس نے سوچا۔

اگلے دس منٹ بے حد تشویش کے عالم میں گزرے۔ پھر راسو کو ایک ایسی فون کال آئی جس نے اسے زیادہ ڈسٹرب کر دیا۔ اس کے چہرے پر ایک سرخی سی چھا گئی تھی۔ اس نے بے حد بے چینی سے مین گیٹ اور اندرونی دروازے کے درمیان دو تین چکر لگائے۔ تب ایک اور کال سننے کے بعد تیزی سے آنیہ کے پاس آیا۔

''مس آنیہ! ویری ساری...... ابھی آپ یہاں سے نکل نہیں سکتیں...... معاملہ زیادہ بگڑ گیا ہے...... آپ کا سیل فون کہاں ہے؟''

آنیہ نے اسے سیل فون دکھایا جو اس نے جلدی سے جھپٹ کر جیب میں ڈال لیا۔

''یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟'' آنیہ حیران ہوئی۔

''یہ سوال جواب کا وقت نہیں...... آ...... آپ میرے ساتھ آئیں...... جلدی۔''

آنیہ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی راسو نے اس کا بازو پکڑا اور اسے قریباً کھینچتا ہوا زباب منزل کی اپر اسٹوری پر لے آیا۔ اس نے یکے بعد دیگرے دو دروازے کھولے اور آنیہ کو ایک اسٹور نما جگہ پر لے آیا۔ وہ ہکا بکا تھی۔ سینے میں دل کبوتر کی طرح پھڑک رہا تھا۔ ''یہ آپ مجھے کہاں لے آئے ہیں، یہ کیا ہو رہا ہے؟''

وہ ہیجانی لہجے میں بولا۔ ''میں جو کہہ رہا ہوں، آپ اس پر عمل کریں۔ ورنہ آپ کا بہت نقصان ہو جائے گا۔ آپ کا شولڈر بیگ کہاں ہے؟''

''وہ...... تو نیچے پڑا ہے۔''

وہ دوڑ کر گیا اور شولڈر بیگ بھی اوپر اس اسٹور نما کمرے میں لے آیا۔ اس نے اپنی جین کی جیب سے چابیوں کا ایک گچھا نکالا۔ دو چابیاں آنیہ کو دکھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ چابی اس کمرے کی ہے۔ یہ دوسری چابی باہر کے چھوٹے گیٹ کی ہے لیکن آپ کو یہاں سے ابھی نہیں نکلنا۔ کم از کم...... کم از کم دن کی روشنی اچھی طرح پھیلنے کا انتظار کرنا ہے۔ کسی کو فون نہیں کرنا، کسی کو پکارنا نہیں۔ بس یہی لگے کہ اس گھر میں کوئی موجود ہی نہیں۔''

''میری سمجھ میں...... کچھ نہیں آ رہا، کیا آپ کہیں جا رہے ہو؟''

راسو نے ایک گہری سانس لی۔ اس کا گریبان کچھ اور کھل گیا۔ سینے کے گھنے بال مزید نمایاں ہو گئے۔ وہ سرسراتے لہجے میں بولا۔ ''یہاں ہنگامی صورت حال پیدا ہو گئی ہے۔ دو بندے مر گئے ہیں۔ پولیس یہاں زباب منزل کے باہر بھی موجود ہے۔ عین ممکن ہے کہ یہ لوگ مجھے بھی یہاں سے گرفتار کر کے لے جائیں۔ مگر پریشانی کی بات نہیں ہے۔ دو چار روز تک میں پھر باہر آ جاؤں گا لیکن اگر پولیس کو یہاں آپ کی موجودگی کا پتا چل گیا تو یہ بڑا مسئلہ ہو جائے گا......''

وہ آنیہ کو مختلف ہدایات دے ہی رہا تھا جب زباب منزل کا بیرونی گیٹ دھڑ دھڑ بجایا جانے لگا۔ آنیہ کا موبائل فون اسے واپس کر کے وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھا لیکن پھر جلدی سے واپس آیا۔ وہ ساتھ والے کمرے میں گیا اور کوئی چیز ڈبل بیڈ کے نیچے کسی خفیہ جگہ پر چھپائی۔ آنیہ نے یہی اندازہ لگایا کہ وہ راسو کا موبائل فون ہے۔ پھر آنیہ پر ایک نظر ڈالتا ہوا وہ نیچے اتر گیا۔

بوکھلائی ہوئی آنیہ نے راسو کی ہدایت کے مطابق اسٹور نما کمرے کا دروازہ اندر سے لاک کر دیا اور لائٹس آف کر کے دم سادھ لیا۔

اگلے پانچ دس منٹ کافی سنسنی خیز اور بے حد تناؤ

www.pakistanipoint.com

بھرے تھے۔ زباب منزل کے مختلف حصوں میں بھاری بوٹوں کی آواز گونج رہی تھی۔ دروازے دھڑا دھڑ کھل رہے تھے اور بند ہو رہے تھے۔ کچھ آوازیں اس اسٹور نما کمرے کے بالکل نزدیک بھی سنائی دیں۔ کسی پولیس افسر کا ایک کرخت جملہ آنیہ کے کانوں تک بھی پہنچا۔ وہ غالباً راسو سے ہی پوچھ رہا تھا کہ وہ لنگڑی کہاں ہے؟ اشارہ یقیناً اس سدرہ نامی لڑکی کی طرف ہی تھا۔

اس سوال کے جواب میں جو کچھ کہا گیا، وہ آنیہ کے کانوں تک نہیں پہنچا۔ کچھ ہی دیر بعد آہٹوں، آوازوں اور للکاروں سے آنیہ کو اندازہ ہو گیا کہ راسو کو گرفتار کر کے زباب منزل سے لے جایا جا رہا ہے۔ وہ دم سادھے، سکتہ زدہ کھڑی رہی۔

☆☆☆

آنیہ گہری تاریکی میں اس تنگ کمرے کے اندر ساکت و جامد بیٹھی تھی۔ اس کا گلا بالکل خشک ہو چکا تھا۔ راسو کی ہدایت کے مطابق اس نے اپنا فون بند کر دیا تھا۔

راسو کے حوالے سے وہ پہلے بھی کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھی اور اب تو جو کچھ ہو رہا تھا، وہ بے حد تشویشناک اور پُرخطر تھا۔ وہ کہہ رہا تھا دو بندے مر گئے ہیں تو کیا ان ہلاکتوں سے اس کا کوئی براہِ راست تعلق تھا؟ اس سے پہلے وہ کسی واردات کے شبہے میں پکڑا گیا تھا اپنی موٹر بائیک سمیت، اور اس سے پہلے بھی خبر نہیں کیا کچھ کر چکا تھا (آنیہ کو وہ واقعہ بھی یاد تھا جب وہ اپنے کسی زخمی ساتھی کا خفیہ طور پر علاج کرانا چاہتا تھا)

فی الوقت آنیہ کے نزدیک سب سے اہم سوال یہی تھا کہ وہ اس چھوٹے سے کمرے میں کب تک بند رہے گی۔ راسو کو اندیشہ تھا کہ اس کی گرفتاری کے بعد بھی پولیس زباب منزل کے قریب موجود رہے گی۔ تو کیا وہ ساری رات یہیں بند رہ کر گزار دے گی؟ آنیہ کے والد ایک بڑے وکیل تھے۔ جالندھر بلکہ پورے ضلع میں ان کو بڑی اچھی طرح جانا پہچانا جاتا تھا۔ چند لمحوں کے لیے آنیہ کے جی میں آئی کہ وہ پاپا کو فون کرے اور اس ساری صورتِ حال کے بارے میں بتا دے۔ وہ والدہ سے زیادہ والد کے نزدیک تھی اور ان سے ہر طرح کی بات کر لیتی تھی۔ بہرحال کچھ مزید سوچنے کے بعد اس نے پاپا کی پریشانی کے خیال سے یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔

تب اس کا دھیان نہار اور دلبر ماموں وغیرہ کی طرف چلا گیا۔ نہار یقیناً اس کے لیے پریشان ہونا شروع ہو گئی ہو گی۔ اسے کسی نہ کسی طرح اطلاع دینا ضروری تھا۔ زباب منزل میں اب مکمل خاموشی تھی۔ بس کسی وقت کسی پالتو بلّی کی "می آؤ...... می آؤ" سنائی دے جاتی تھی۔ پندرہ بیس منٹ بعد آنیہ نے تھوڑی سی ہمت کی اور راسو کی دی ہوئی چابیوں میں سے ایک چابی مخفی قفل میں لگا کر اس اسٹور نما کمرے کا دروازہ کھول لیا۔ اس کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ کمرے سے باہر نکل کر اس نے دیکھا کہ دروازہ، دیوار کا ہم رنگ تھا اور دیوار کی PENELING کا حصہ ہی دکھائی دیتا تھا۔ اسے علیحدہ سے دیکھنا آسان نہیں تھا۔ اردگرد کے کمروں میں بے ترتیبی سی تھی۔ جاتے جاتے پولیس والوں نے کافی اکھاڑ پچھاڑ کی تھی۔ مختلف اشیا یہاں وہاں بکھری ہوئی تھیں۔

اس نے لابی کی لائٹس آن نہیں کیں، اندھیرے میں ہی دھیان سے قدم رکھتی ہوئی ایک کشادہ سلائڈنگ ونڈو کے پاس پہنچی۔ شیشے کے پار زباب منزل کے سامنے والی سڑک کا کچھ حصہ اور ایک دو گلیاں نظر آتی تھیں۔ یہ دیکھ کر اس کے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی کہ گلی کے موڑ پر ایک نیلی روشنی "ریوالو" کر رہی تھی۔ یقیناً یہ کسی پولیس کار یا جیپ کی روشنی ہی تھی۔ راسو کا اندیشہ درست تھا۔ پولیس یہاں موجود تھی۔ وہ بغیر آواز پیدا کیے دوبارہ سے اسٹور نما کمرے میں گھس گئی۔ تھوڑی دیر سوچ کر اس نے اپنا موبائل آن کیا اور جلدی سے ایک ٹیکسٹ میسج نہار کے لیے بھیج دیا۔ اس نے لکھا۔ "میرے بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں یہاں ایک مشکل میں ضرور پھنس گئی تھی لیکن اب بالکل خیر خیریت سے ہوں۔ صبح آٹھ نو بجے تک واپس آ جاؤں گی۔ فی الحال میرا فون بند رکھنا ضروری ہے اگر ممکن ہوا تو رات کو کسی وقت کال کروں گی۔ خدا حافظ۔" میسج بھیج کر اس نے فون دوبارہ آف کر دیا۔

اس کا دھیان ایک بار پھر شہابی اور اس سے ہونے والی گفتگو کی طرف چلا گیا۔ پتا نہیں وہ کہاں چھپا بیٹھا تھا؟ نجانے کیوں آنیہ کو لگنے لگا تھا کہ وہ جھوٹ بھی بولتا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اس نے ظہیر اور نادیہ کو ایم پی اے کے گھر سے نکال دیا ہے۔ اس کا لہجہ اس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ شاید اصل حقیقت یہ تھی کہ اس نے ان دونوں مصیبت زدگان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا اور وہ اپنے بُرے انجام کی طرف بڑھ گئے تھے۔

اگلے قریباً دو گھنٹے آنیہ نے اسی کمرے میں بند رہ کر گزارے۔ سیکڑوں ہی وسوسے اس کے ذہن میں کلبلا رہے تھے مگر پھر دھیرے دھیرے اس کا خوف کم ہونے لگا۔ رات

www.pakistanipoint.com

کے قریباً ایک بجے کا عمل تھا۔ زباب منزل میں مکمل خاموشی تھی۔ کم از کم اتنا تو اندازہ ہو رہا تھا کہ اس عمارت کے اندر کوئی پولیس والا موجود نہیں ہے۔ اس نے ایک بار پھر ہمت کی اور باہر نکل آئی۔ تاریک لابی میں سے دیکھا۔ سڑک کے موڑ پر پولیس کی موجودگی کو اب بھی رد نہیں کیا جا سکتا تھا، بہر حال نیلی لائٹ اب دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس مستطیل بیڈ روم کی جانب آ گئی جہاں راسو نے جاتے جاتے کچھ چھپایا تھا۔ تجسس سے مجبور ہو کر وہ گھٹنوں پر جھک گئی اور بیڈ کے نیچے جھانکنے لگی۔ کئی منٹ کی کوشش سے وہ بیڈ کے نچلے حصے میں ایک چھوٹا سا چور خانہ ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس خانے میں کچھ اشیا موجود تھیں۔ سب سے پہلے آنیہ کی نظر سیاہ رنگ کے کولٹ پسٹل پر پڑی۔ وہ فلی لوڈڈ تھا۔ پسٹل کے پاس ہی راسو کا موبائل فون بھی رکھا تھا۔ غالباً یہی دونوں اشیا تھیں جو گرفتاری سے پہلے راسو نے یہاں رکھی تھیں۔ اس نے موبائل نکالا وہ آن تھا مگر سائیلنٹ پر لگا ہوا تھا۔ اس پوشیدہ خانے میں تھوڑی سی جیولری نظر آ رہی تھی۔ کسی گاڑی کی رجسٹریشن بک تھی اور ڈارک براؤن کور والی ایک ڈائری تھی۔

آنیہ نے وہیں قالین پر بیٹھ کر راسو کے موبائل فون پر نگاہ دوڑائی۔ راسو اور شہابی کے بارے میں جاننے کی شدید خواہش اس میں موجود تھی۔ اس نے ''کال لاگ'' چیک کی، پھر پیغامات دیکھے۔ تین چار آخری پیغامات نے اسے چونکایا۔ غالباً راسو جلدی میں انہیں ڈیلیٹ نہیں کر سکا تھا۔ کل رات نو بجے راسو نے اپنے کسی دوست شادے کو ٹیکسٹ میسج بھیجا تھا۔ ''میری اطلاع کے مطابق لڑکی نادیہ کی طبیعت خراب ہے...... نادیہ اور ظہیر تھوڑی دیر میں کلینک جانے کے لیے نکلیں گے۔ ایم پی اے صاحب کا گارڈ اور ڈرائیور ساتھ ہو گا۔ یہ بہترین موقع ہے۔ تم تیار رہو، میں آ رہا ہوں۔''

قریباً دو گھنٹے بعد رات گیارہ بجے راسو نے ایک مبہم سا پیغام اپنے کسی جاننے والے یا دوست ''شکیل اسنوکر'' کو ارسال کیا تھا۔ ''دونوں پنچھی، چیل کے جھپٹے سے بچ گئے ہیں۔ ہمارے پاس ہیں۔ بالکل خیریت سے ہیں۔ سمجھو کہ چہچہا رہے ہیں، تھینکس گاڈ۔''

قریباً 15 منٹ بعد سوا گیارہ بجے یکے بعد دیگرے شہابی کی تین کالز راسو کے اس نمبر پر آئی تھیں جو اس نے اٹینڈ نہیں کی تھیں۔ پھر شہابی کا ٹیکسٹ میسج راسو کے لیے آیا تھا۔ ''تم سؤر کی اولاد ہو۔ مجھے پتا ہے، جو کیا ہے تم نے کیا ہے۔ تمہاری یہ پائے خانیاں ہم سب کو لے ڈوبیں گی۔ اس کنجر اروڑا نے سب سے پہلے میرا ٹیٹوا ہی دبانا ہے اور اگر اسے کوئی ثبوت مل گیا ناں تو یاد رکھو، وہ تمہاری بھی ساری اگلی پچھلی کسر نکال دے گا، لعنت ہو تم پر۔''

آخری میسج آج صبح سویرے کا تھا اور یہ راسو نے شہابی کو بھیجا تھا۔ ''فکر نہ کرو، کچھ نہیں ہو گا اور اگر کوئی مشکل آئی بھی تو خود پر ہی لوں گا۔ ان پنچھیوں کو دردناک انجام سے بچا کر جو راحت ملی ہے، اس کے بدلے میں دو چار ہڈیاں بھی تڑوانا پڑیں تو گھاٹے کا سودا نہیں۔''

یہ پیغامات دیکھ کر، جیسے ایک تصویر سی آنیہ کی نگاہوں کے سامنے مکمل ہو گئی۔ اسے یہ جان کر حیرت ہو رہی تھی کہ ''ظہیر'' اور ''نادیہ'' کو واقعی ایم پی اے انوار کے گھر سے نکال لیا گیا ہے اور اروڑا وغیرہ سے دور کر دیا گیا ہے مگر یہ کام شہابی حیدر نے نہیں راسو نے کیا تھا...... اور...... ابھی تھوڑی دیر پہلے راسو کی جو گرفتاری عمل میں آئی تھی، اس کے پیچھے بھی غالباً اس کی یہی سنگین کارروائی تھی۔

لگ یہی رہا تھا کہ ابھی ڈھائی تین گھنٹے پہلے مین بازار میں جو فائرنگ ہوئی ہے، وہ پولیس اور راسو کے ساتھیوں میں ہوئی ہے۔ شاید راسو کا کوئی ساتھی پولیس کے ہتھے بھی چڑھا تھا اور اسی وجہ سے پولیس چند منٹ میں دندناتی ہوئی زباب منزل پہنچ گئی تھی۔ مقامی پولیس اور راسو کے تعلقات پہلے بھی کچھ زیادہ اچھے نہیں لگتے تھے۔ یہ شخص عجیب سا گورکھ دھندا تھا۔ ایک دن نہار کور نے یہ خیال بھی ظاہر کیا تھا کہ شاید اس کا تعلق کسی تنظیم وغیرہ سے ہو۔ ممکن تھا کہ وہ اپنی اسنوکر کلب والی مصروفیت کو صرف ایک آڑ کے طور پر استعمال کرتا ہو۔

آنیہ نے راسو کے موبائل میں کچھ مزید جھانکا۔ وہ جو اسنوکر کلب چلا رہا تھا، اس کی کچھ تصاویر تھیں، کچھ تصویریں اس کے قریبی دوستوں کی تھیں۔ وہ بھی اسی کی طرح اپنے حلیے سے بے پروا اور آوارہ گرد نظر آتے تھے۔ چند پیغامات ایسے تھے جن میں کسی اچھے کھلونے کا ذکر کیا گیا تھا۔ آنیہ کو بھی لگا کہ کھلونے سے مراد کوئی ہتھیار وغیرہ ہے...... اور جس بچے کے لیے کھلونا درکار ہے وہ خود راسو یا اس کا کوئی ساتھی ہے۔ کوئی ایک ماہ پرانی ایک تصویر دیکھ کر وہ بری طرح چونکی اور ایک بار پھر اس کے اندر راسو کے لیے ناپسندیدگی اور غصے کی لہر سی ابھری۔ یہ خود آنیہ کی تصویر تھی اور راجوری میں اس کی پچھلی آمد کے موقع پر اتاری گئی تھی۔ آنیہ فورٹ میں بڑی محویت سے ایک محرابی دروازہ دیکھ رہی تھی۔ اس کے

www.pakistanipoint.com

بال منتشر تھے اور گلابی آنچل ہوا میں لہرا رہا تھا۔ یہ تصویر آنیہ کی بے خبری میں اتاری گئی تھی۔ راسو کے موبائل میں موجود اس تصویر کے نیچے ایک شعر لکھا تھا۔

خطا تو جب ہو کہ ہم حال دل کسی سے کہیں
کسی کو چاہتے رہنا کوئی خطا تو نہیں

آنیہ کا دل چاہا کہ تصویر کو ڈیلیٹ کر دے مگر پھر اسے یہ مناسب نہیں لگا۔ اس نے موبائل اسی طرح چور خانے میں واپس رکھ دیا۔ اس نے گاڑی کی بوسیدہ رجسٹریشن بک دیکھی اس میں بھی کچھ رسیدیں اور فوٹو گراف موجود تھے۔ ان میں سے دو فوٹوز چونکا دینے والی تھیں۔ ایک فوٹو میں وہی ٹانگ سے معذور لڑکی سدرہ نظر آ رہی تھی۔ اس کے ساتھ جو شخص نظر آ رہا تھا، وہ یقیناً وہی کرنل اروڑا تھا جسے آنیہ نے ہاؤسنگ سوسائٹی کے عالیشان آفس میں دیکھا تھا۔ اس نے سدرہ کو اس کے لمبے بالوں سے پکڑا ہوا تھا اور بے دردی سے کھینچ کر کسی کمرے سے باہر لا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اسے اپنے کمرے یا دفتر سے باہر دھکیل رہا ہے۔

دوسری کارڈ سائز تصویر بالکل مختلف منظر پیش کرتی تھی۔ اس میں کرنل اروڑا شادی کے لباس میں تھا اور اگنی کے پھیرے لے رہا تھا۔ حیرت انگیز طور پر جو دلہن اس کے ساتھ پھیرے لے رہی تھی، وہ سدرہ تھی۔ ادھیڑ عمر اروڑا کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی جبکہ کومل سی خوبرو سدرہ مظلومیت کی تصویر نظر آتی تھی۔

آنیہ چکرا سی گئی۔ یہ کیا ماجرا تھا؟ ایک مسلمان لڑکی کی شادی ایک ادھیڑ عمر ہندو سے؟ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ اس شادی کے لیے ہندو ہو گئی ہو؟ یہ ناممکن تھا۔ پھر سدرہ کی ٹانگ کا نقص۔ کم از کم ان تصاویر سے تو یہی اندازہ ہوتا تھا کہ تب سدرہ کی ٹانگ ٹھیک ہی تھی۔ وہ سوچتی رہی، پھر ایک نیا خیال آنیہ کے ذہن میں آیا، کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ یہ سدرہ پہلے ہندو ہو، بعد میں مسلمان ہوئی ہو مگر اتنی خوب صورت لڑکی کی شادی اتنی پکی عمر کے فوجی افسر سے...... جس تصویر میں اروڑا، سدرہ کو بالوں سے کھینچ کر کمرے سے باہر دھکیل رہا تھا، اس میں ایک اور چیز بھی نوٹ کرنے والی تھی۔ اروڑا کے گہرے گندمی چہرے پر کسی سرخ بال پوائنٹ سے کراس کا نشان لگایا گیا تھا۔ یہ ایک طرح سے اس شخص سے نفرت کا اظہار بھی تھا۔ یہ اظہار کس نے کیا تھا؟ کیا یہ راسو کی طرف سے تھا۔ تھوڑی دیر پہلے پڑھا جانے والا میسج آنیہ کے ذہن میں آیا۔ شہابی نے راسو کو لکھا تھا۔ ''اس کنجر اروڑا نے سب سے پہلے میرا ٹیٹوا ہی دبانا ہے اور اگر اسے کوئی ثبوت مل گیا ناں تو یاد رکھو وہ تمہاری بھی ساری اگلی پچھلی کسر نکال دے گا، تصویر کی پشت پر سرخ روشنائی سے ہی ایک فقرہ بھی درج تھا......ہم نہیں مانتے، ظلم کے ضابطے۔

پتا نہیں کہ یہ کیا گورکھ دھندا تھا؟ آنیہ نے تصویروں سمیت رجسٹریشن بک دوبارہ پوشیدہ خانے میں رکھ دی تھی۔ اسے ان سارے معاملات سے سخت الجھن محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ ابھی رات کے دو بجے تھے۔ کم از کم پانچ چھ گھنٹے مزید اسے اسی خالی زباب منزل میں گزارنے تھے۔ عمارت کے عقبی باغیچے کی طرف سے ایک بار پھر بلی کی ''می آؤ می آؤ'' سنائی دی۔ پھر دو بلیاں لڑنے لگیں۔ آنیہ کا دل چاہا کہ وہ موبائل فون آن کر کے نہار کو موجودہ صورتِ حال سے آگاہ کرے مگر پھر راسو کی تاکید یاد آئی کہ وہ اپنا فون بند ہی رکھے تو بہتر ہے۔

اس نے ہاتھ لمبا کر کے بیڈ کے چور خانے میں سے ڈارک براؤن کور والی ڈائری نکال لی اور ورق گردانی کرنے لگی۔ اس ڈائری میں بس کہیں کہیں دو چار فقرے ہی ہندی ٹیکسٹ میں لکھے ہوئے تھے باقی ساری ڈائری کی تحریریں کسی اور زبان میں تھیں۔ بہت باریک، نفیس سی لکھائی تھی مگر کوئی لفظ پلے نہیں پڑتا تھا۔ یہ سنسکرت ہرگز نہیں تھی۔ شروع میں آنیہ کو لگا کہ شاید یہ گجراتی یا کشمیری ہے مگر یہ خیال بھی غلط ہی ثابت ہوا۔ پتا نہیں کہ آنیہ کے ذہن میں کیا آیا۔ اس نے اپنا موبائل فون نکالا اور دس پندرہ منٹ میں اس ڈائری کے ساٹھ ستر صفحات کی تصاویر لے لیں۔

بعدازاں اس نے ساری اشیا اسی ترتیب کے ساتھ دوبارہ چور خانے میں رکھیں اور اسے بند کر کے واپس اسٹور نما کمرے میں آ گئی۔ موبائل فون تو وہ آن کر ہی چکی تھی۔ اس نے حیران و پریشان نہار کور سے رابطہ کیا اور بڑی دھیمی آواز میں اسے زباب منزل کی ساری صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔

گفتگو کے آخر میں نہار کور نے بے حد پریشان لہجے میں اسے مشورہ دیا کہ وہ صبح سویرے پانچ اور چھ بجے کے درمیان وہاں سے نکلنے کی کوشش کرے، کیونکہ اس وقت رات بھر ڈیوٹی دینے والے پولیس اہلکار اپنی جگہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ پہلی بار نہار کور کو بھی خوف زدہ محسوس ہوئی تھی۔ یہاں کے سارے معاملات بہت بگڑے ہوئے لگ رہے تھے۔

تاریخ کے اوراق پر بکھری داستان کے
مزید واقعات اگلے ماہ پڑھیے

www.pakistanipoint.com

آنیہ اور نہار کور راجوری سے واپس جالندھر جا رہی تھیں۔ یہ سب کچھ آناً فاناً ہی ہوا تھا۔ ماموں دلبر سنگھ بھی ہکا بکا رہ گئے تھے اچانک دونوں کی واپسی کا پروگرام کیسے بن گیا۔ حقیقت یہی تھی کہ آنیہ اب ایک منٹ بھی یہاں رکنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتی تھی کہ خیر خیریت کے ساتھ زباب منزل سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ راسو کی ہدایت کے مطابق وہ صبح چھ بجے کے لگ بھگ بالائی منزل سے اتری تھی۔ راسو کی دی ہوئی چابی کے ساتھ اس نے بیرونی گیٹ کا چھوٹا دروازہ اِن لاک کیا تھا اور اپنی دھڑکنوں کو سنبھالتی ہوئی وہاں سے نکل آئی تھی...... اور اب صرف دس گھنٹے بعد وہ دونوں بذریعہ بس جالندھر کی طرف رواں تھیں۔

بس میں سوار ہوتے وقت نہار کور نے ایک اخبار لیا تھا اور اس کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ پھر وہ اخبار دیکھتے دیکھتے ایک دم چونکی۔ ''یہ دیکھو آنیہ جانی! یہاں رات والی خبر لگی ہوئی ہے۔''

آنیہ نے بھی ٹھٹک کر دیکھا۔ اخبار کے اندرونی صفحے پر ایک ''دو کالمی'' خبر موجود تھی۔ لکھا تھا۔ ''راجوری میں مرغزار کے علاقے میں ایک پولیس ناکے پر مشکوک کار سواروں اور پولیس کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہوا۔ اس میں ایک فرد موقع پر ہلاک ہوا، جبکہ دو شدید گھائل ہوئے۔ ان میں ایک اے ایس آئی بھی شامل ہے۔ گھائل ہونے والوں میں سے دوسرا فرد اسپتال میں چل بسا۔ خیال ظاہر کیا جا رہا ہے کہ اس واقعے کا تعلق پرسوں والی اس واردات سے ہے جس میں راجوری کے پریمی جوڑے ظہیر اور نادیہ کو ایک پرائیویٹ کلینک کے پاس سے مبینہ طور پر اغوا کر لیا گیا تھا۔ ابھی تک ظہیر اور نادیہ کا کوئی کھوج نہیں ملا۔ اس سلسلے میں چند گرفتاریاں بھی عمل میں آئی ہیں۔''

خبر دیکھ کر آنیہ نے ماتھے سے پسینا پونچھا۔ یقینی طور پر راسو اس کیس میں ملوث تھا۔ وہ گرفتار ہو چکا تھا۔ اب پتا نہیں اس نے کیا کچھ اُگل دینا تھا۔ اس بات کا اندیشہ بھی تھا کہ نہار اور آنیہ کی زباب منزل میں آمد و رفت بھی سامنے آ جاتی...... اور یوں پولیس ان تک بھی پہنچتی اور سوال جواب کرتی۔ بہر حال ابھی یہ صرف قیاس آرائی ہی تھی۔

راسو نے غالباً کام تو اچھا کیا تھا مگر اب اس واقعے میں دو ہلاکتیں شامل ہو گئی تھیں اور یہ سنگین تر ہو گیا تھا۔

بس ہموار سڑک پر تیز رفتاری سے جا رہی تھی۔ نہار نے نشست کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اسی طرح آنکھیں بند کیے کیے مدھم آواز میں بولی۔ ''آنیہ اوپر والے کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اس نے جلدی ہماری آنکھیں کھول دیں...... تمہارے سامنے شہابی حیدر کا اصل کردار آ گیا۔ ورنہ شاید دیر ہو جاتی۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' آنیہ نے تائید کی۔

نہار اسی کھوئے کھوئے آہنگ میں بولی۔ ''اس شہابی حیدر کے بارے میں تھوڑی سی مزید جانکاری مجھے بھی ملی ہے۔ صحافتی حلقوں میں اس کا نام تو ہے مگر اس کی ''ریپو'' کچھ زیادہ اچھی نہیں۔ وہ کئی ملازمتیں بدل چکا ہے...... ایک اخبار کی ملازمت کے دوران میں اسے بدعنوانی کے ایک معاملے کا سامنا کرنا پڑا اور اسے نکال دیا گیا۔ اگر یہ بندہ......''

''پلیز نہار، اب چھوڑو اس ذکر کو۔ مجھے سخت اُلجھن ہوتی ہے، کوئی اور بات کرو۔'' آنیہ نے بیزار لہجے میں کہا۔

نہار گہری سانس لے کر چپ ہو گئی۔

اسی دوران میں آنیہ کے پاپا خورشید عالم صاحب کا فون آ گیا۔ وہ ایک کیس کی پیروی کے سلسلے میں امرتسر میں تھے۔ انہوں نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ ''آنو! یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ تم واپس آ رہی ہو؟''

''جی پاپا۔''

''اتنی جلدی، خیریت تو ہے؟''

''بس پاپا! راجوری کا موسم عجیب ہو رہا ہے۔ روزانہ ہی بارش ہو جاتی ہے۔ ٹھیک سے کام بھی نہیں ہو رہا تھا۔ نہار کی طبیعت بھی کچھ خراب ہے اس لیے واپس آ رہے ہیں۔''

''اور وہ کیمپ ٹیشن؟''

''ابھی تو پوسٹ پونڈ ہی کر دیا ہے پھر دیکھ لیں گے۔'' آنیہ نے کہا۔

☆☆☆

آنیہ کو راجوری سے واپس آئے دوسرا دن تھا۔ وہ بیسمنٹ میں موجود تھی۔ جو پینٹنگز اس نے راجوری کے قلعے میں بنائی تھیں، وہ ایک گوشے میں الٹی سیدھی پڑی تھیں۔ ان میں ایک ادھوری پورٹریٹ بھی تھی۔ یہ شہابی حیدر کی تھی۔ وہ بڑی نفیس پینٹ شرٹ میں...... باقاعدہ ٹائی لگائے ایک درخت سے کندھا ٹیکے کھڑا تھا۔ آنیہ اپنی جگہ سے اٹھی اور عجب کوفت کے عالم میں تصویر پر برش پھیر کر اسے ضائع کر دیا۔ تب اس نے وہ کینوس بھی پھاڑ کر پھینک دیا۔ وہ عجب یاس کے عالم میں سوچنے لگی۔ کبھی کبھی ہمارے ''خیال'' کتنے خام ثابت ہوتے ہیں۔ اس کا ہمیشہ یہ خیال رہا تھا کہ البم کی سو سال پرانی تصویر میں نظر آنے والی بے مثل دلیری اور جرأت نے آگے تک سفر کیا ہوگا۔ کم از کم اگلی ایک دو نسلوں تک تو ضرور گئی ہوگی اور اسی دلیری اور بے مثل ''فیبر

www.pakistanipoint.com

ایکسپریشنز'' کو ڈھونڈنے کے لیے وہ راجوری جا پہنچی تھی اور پھر یہ ثابت ہوا تھا کہ سب کچھ ویسا نہیں ہوتا جیسا ہم سوچتے ہیں۔ضروری نہیں ہوتا کہ انسان کی ساری خوبیاں یا ساری خامیاں آئندہ نسلوں تک منتقل ہوں۔خون میں خون شامل ہوتے ہیں اور انسانی فطرت میں تبدیلیاں آتی چلی جاتی ہیں۔شیر بچہ اپنے باپ کی طرح فوجی بنا تھا...... مگر اس کا بیٹا کوہ پیما بن گیا تھا اور اس کا بیٹا صحافی ...... مگر ایسا صحافی نہیں جس پر فخر کیا جا سکتا......

وہ ایک آہ سی بھر کر صوفے پر نیم دراز ہو گئی اور آنکھیں بند کر لیں...... پھر ایسا کیوں ہوا تھا؟ کیوں جب جب اس نے البم کی تصویر دیکھی تھی اور اسد اللہ کی آنکھوں میں جھانکا تھا، اسے لگا تھا کہ ان آنکھوں میں لشکارا مارنے والی دلیری منفرد ہے...... یہ رکنے والی نہیں، یہ منقطع ہونے والی نہیں...... یہ آگے تک جائے گی۔جیسے شیر کیسے بھی حالات سے گزرے، رہتا تو شیر ہی ہے۔اس کی جبلت کو مکمل طور پر بدلا نہیں جا سکتا۔

اچانک دستک کی آواز نے اسے خیالوں سے چونکایا۔ یہ ماما تھیں اور اسے باہر آنے کے لیے کہہ رہی تھیں۔وہ باہر آئی تو اسے پتا چلا کہ اس کا خالہ زاد فرحان آیا بیٹھا ہے۔وہ مرے مرے قدموں سے باہر آئی۔وہ اُسے دیکھتے ہی جوش سے بولا۔''میں تو یونہی خالہ سے ملنے آیا تھا۔یہاں آکر پتا چلا کہ تم بھی آگئی ہو، بہت اچھا سرپرائز ہے بھئی، زبردست۔''

ماما بولیں۔''بس اس کی فرینڈ کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی تھی اس لیے یہ دونوں جلدی چلی آئیں۔''

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' فرحان نے آنیہ سے پوچھا۔

''ابھی کچھ دیر پہلے تک تو ٹھیک تھی۔'' اس نے کہا پھر ماما کے تاثرات دیکھ کر جلدی سے بولی۔''مگر اب سر میں ہلکا سا درد ہو رہا ہے۔''

''تہ خانے میں بند رہو گی تو یہی کچھ ہوگا۔چلو تمہیں تھوڑی سی تازہ ہوا کھلاتا ہوں۔ایک بڑی اچھی خبر بھی سنانی ہے تم کو۔'' وہ بے تکلفی سے بولا۔

''تو یہیں پر سنا دیں نا۔''

''خالہ کو تو سنا چکا ہوں، تمہیں باہر جا کر سناؤں گا اور مٹھائی بھی کھلاؤں گا۔''

''ارے کہیں منگنی شنگنی تو نہیں ہو گئی آپ کی؟'' وہ بے حد خوش ہو کر بولی۔

فرحان کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔چہرے پر واضح طور پر سٹپٹاہٹ نظر آئی۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، اس کے فون پر کال آگئی۔ یہ کوئی اہم کاروباری کال تھی۔ وہ باتیں کرنے لگا۔ ماما خشمگیں نظروں سے آنیہ کو گھور رہی تھیں۔ انہوں نے اشارے سے آنیہ کو باہر بلایا۔

دوسرے کمرے میں جا کر انہوں نے دانت پیسے اور تیز سرگوشی کے لہجے میں بولیں۔''آنو! میں سچ کہتی ہوں، بہت بُری طرح پچھتائے گی۔اپنی حرکتوں سے باز آجا۔مرد ذات کو بگڑتے دیر نہیں لگتی۔''

''لیکن میں نے کیا کہہ دیا ماما؟'' وہ ٹھٹکی۔

''آہستہ بول۔'' انہوں نے آنکھیں نکالیں۔''وہ اتنے پیار سے تمہیں لے جانے کا کہہ رہا ہے اور تم آگے سے اسے منگنی کے ٹھٹھے مار رہی ہو۔'' ان کی آواز بھرّا گئی۔''بہت دل دُکھاتی ہو تم میرا...... بہت دل دُکھاتی ہو......''

''ماما! میں سچ کہہ رہی ہوں، میرا سر دکھ رہا ہے۔''

''مت کہا کر مجھے ماما، میں نہیں ہوں تیری ماما۔اگر ہوتی تو تُو اس طرح ہر وقت اپنی باتوں کی چھری سے میرا گوشت نہ کاٹتی۔'' انہوں نے گلوگیر آواز میں کہا اور دروازہ زور سے بند کرتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔

آنیہ کچھ دیر تک گم صم کھڑی سوچتی رہی۔اسے توقع نہیں تھی کہ ماما کا موڈ اتنا خراب ہو جائے گا۔اس کے ذہن میں کشمکش سی تھی۔کسی وقت وہ خود بھی سوچنے لگتی تھی کہ کہیں وہ کوئی غلطی تو نہیں کر رہی۔آخر اس نے ایک گہری سانس لی اور ڈھیلے ڈھالے قدموں سے اس کمرے میں آگئی جہاں فرحان فون پر باتوں میں مصروف تھا۔

آدھ گھنٹے بعد آنیہ اور فرحان چچماتی ''ہنڈائی'' پر سٹی سینٹر کی طرف جا رہے تھے۔آنیہ کے ساتھ آنے سے فرحان کا موڈ اچھا ہو گیا تھا۔وہ بات بات پر ہنس رہا تھا۔ہنستے ہوئے اس کے فربہ رخساروں کا گوشت کانوں کی طرف دوڑتا محسوس ہوتا تھا۔''کس خوش خبری کی بات کر رہے تھے آپ؟'' آنیہ نے پوچھا۔

''وہی خوش خبری جو میں تمہیں چھ سات روز سے سنانا چاہ رہا ہوں۔کوئی بیس بار فون کیا ہوگا لیکن کبھی تمہارا فون بند جاتا تھا، کبھی کال اٹینڈ نہیں ہوتی تھی۔''

''بس...... بتایا ہے نا کہ نہار کی طبیعت کچھ خراب تھی، اسی کے چکر میں رہی۔''

''کسی نہ کسی چکر میں تو تم ہر وقت ہی رہتی ہو اور سب

www.pakistanipoint.com

سے بُرا چکر تو مجھے یہ پینٹنگ والا لگتا ہے۔ پلیز آنیہ! ختم کرو اب اس بچپنے کو، بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ باقی کی پڑھائی بھی ہمارے گھر......''

''فار گاڈ سیک فرحان۔'' آنیہ نے ناگواری سے اس کی بات کاٹی...... پھر چند سیکنڈ بعد نارمل لہجے میں بولی۔ ''آپ خوش خبری کی بات کرنے لگے تھے؟''

فرحان نے جوشیلے انداز میں اس کے گھٹنے کو دبایا اور بولا۔ ''چمبا ٹاؤن میں ایک بڑا ٹھیکا ملا ہے لکڑی کے کام کا۔ تمہیں اندازہ ہے کتنے کا ٹھیکا ہوگا؟''

''کتنے کا؟'' آنیہ نے بے دلی سے پوچھا۔

''قریباً قریباً ساڑھے پانچ کروڑ کا۔ پانچ پانچ مرلے کے پندرہ بیس گھر ہیں جن کا سارا لکڑی کا کام کرنا ہے۔''

''تو پھر چمبا جا رہے ہیں؟''

''جا تو نہیں رہا...... مگر آنا جانا لگا رہے گا۔ دو ڈھائی سو کلو میٹر سفر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بائی ائر کا کوئی انتظام ہو جائے۔''

''بائی ائر؟'' آنیہ حیرانی سے بولی۔

''وہ جو اپنا جے پوری یار ہے نا وہ ایک چھوٹا کمرشل ''چاپر'' لے رہا ہے۔ اکثر چمبا آتا جاتا رہتا ہے۔'' فرحان نے فخریہ انداز میں کہا۔ لہجے سے عیاں تھا کہ شیخی بگھار رہا ہے۔

آنیہ بولی۔ ''آپ کے زیادہ یار ہندو ہی ہیں۔ یہ وہی راجندر چوہان ہے نا جو پچھلے سال ابوظہبی میں شراب نوشی اور لڑکی سے زبردستی کرنے کے الزام میں پکڑا گیا تھا؟''

''اوہو آنیہ تم منفی باتوں پر ہی کیوں دھیان دیتی ہو۔ راجندر کو عدالت نے بری بھی تو کیا تھا اور پھر یہی راجندر ہے جس نے غریب لوگوں کی بھلائی کے لیے ٹرسٹ بھی قائم کر رکھا ہے۔''

''اور جناب نے خود ہی بتایا تھا کہ یہ ٹرسٹ اسے ''ٹیکس'' وغیرہ بھرنے کے سلسلے میں فائدہ دیتا ہے۔''

فرحان بُرا سا منہ بنا کر رہ گیا۔ شاید یہ گفتگو بحث کی شکل اختیار کر جاتی مگر اسی دوران میں گاڑی ریسٹورنٹ کی پارکنگ میں داخل ہوگئی۔

ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر فرحان نے آنیہ کو اس 'سائٹ' کی تصاویر بھی دکھائیں جہاں اسے بڑا ٹھیکا ملا تھا۔ یہ کوئی ہاؤسنگ سوسائٹی لگتی تھی۔ متعلقہ لوگوں کے ساتھ دو تین گروپ فوٹو بھی تھے۔ ایک گروپ فوٹو کو دیکھ کر آنیہ چونکی۔ اس میں چند سوٹڈ بوٹڈ افراد کے ساتھ وہی کرخت چہرے والا ریٹائرڈ کرنل اروڑا بھی نظر آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے دو تین مسلح گارڈز تھے۔ فرحان اس کے پہلو میں موجود تھا۔

''یہ...... یہ کون ہے؟'' آنیہ نے پوچھا۔

''یہی تو مالک ہیں، سابق فوجی ہیں۔ بڑی توپ قسم کی چیز ہیں۔ ان کا رئیل اسٹیٹ کا کام تیزی سے پھیل رہا ہے...... تم جانتی ہو انہیں؟''

''نن...... نہیں۔ یونہی صورت کچھ پہچانی سی لگ رہی تھی۔'' آنیہ نے بات بنائی۔

اسی دوران میں ویٹر جوسز اور دیگر لوازمات لے آیا۔ فرحان ان اشیا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اروڑا کا خیال ذہن میں آتے ہی آنیہ کا دھیان شہابی حیدر کی طرف بھی چلا گیا۔ اس کے اندر ایک ناگوار سی کیفیت پیدا ہوئی۔ وہ منظر اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم گیا جب وہ ہاؤسنگ سوسائٹی کے آفس میں تھی اور اتفاقاً ایک ہائی سیکیورٹی ایریا میں جانے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ اس نے شہابی کو دیکھا تھا۔ وہ کرنل اروڑا کے سامنے بت بنا کھڑا تھا اور اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ پچھلے دو تین دن میں شہابی نے چار پانچ دفعہ آنیہ سے فون پر رابطے کی کوشش کی تھی۔ آنیہ نے کال اٹینڈ نہیں کی تھی...... اور آخر میں اس کا نمبر ہی بلاک کر دیا تھا۔

☆☆☆

وقت اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھتا رہا...... قریباً دو ڈھائی ماہ اسی طرح گزر گئے۔ راجوری اور وہاں کے تمام معاملات سے آنیہ اور نہار کنارہ کش ہو گئی تھیں۔ آنیہ نے وہ ساری پینٹنگز اسٹور روم میں پھینک دی تھیں جو اس نے ''مصوری کے مقابلے'' کے لیے بنائی تھیں۔ اب تو مقابلے کی تاریخ گزرے بھی دو تین ہفتے گزر چکے تھے۔ بس ماموں دلبر سے کبھی کبھار فون پر آنیہ کی بات ہو جاتی تھی۔ پچھلے ہفتے دلبر ماموں سے جو گفتگو ہوئی، اس سے ایک اہم بات آنیہ کو اور نہار کو معلوم ہوئی تھی۔ ماموں نے بتایا تھا کہ شہابی حیدر کے دوست راسو کے بارے میں ایک خبر پھیلی ہوئی ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ پولیس کی حراست میں نہیں ہے بلکہ فرار ہو چکا ہے، پولیس اسے ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔ دلبر ماموں کے مطابق راسو کے فرار ہونے کا واقعہ کوئی ڈیڑھ ماہ پہلے پیش آیا تھا۔

یہ خبر چونکا دینے والی تھی۔ راسو کو یقیناً اس وجہ سے گرفتار کیا گیا تھا کہ اس نے پریمی جوڑے یعنی ظہیر اور نادیہ کو ٹھیکیدار نرائن اور کرنل اروڑا کے چنگل سے بچایا تھا۔ یہ بات

بھی طے تھی کہ لڑکی لڑکے کو برآمد کرانے کے لیے راسو پر تشدد وغیرہ بھی کیا گیا ہوگا۔ آنیہ اور نہار کو اندیشہ تھا کہ وہ ظہیر اور نادیہ کے بارے میں اُگل دے گا مگر اب اس تازہ خبر کے بعد یہ خوش فہمی پالی جا سکتی تھی کہ شاید شادی شدہ جوڑا ابھی تک محفوظ ہو۔

آنیہ اس بارے میں مزید جاننا چاہتی تھی۔ ایک روز اس نے خود دلبر ماموں کو فون کر ڈالا۔

''ہیلو، میری دھی رانی کیسی ہے؟'' وہ ہمیشہ کی طرح چہکے۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں ماموں، آپ کیسے ہیں؟''

''میں ویسے کا ویسا ہی ہوں۔ ڈائٹنگ والا حربہ بھی تقریباً ناکام ہو گیا ہے جب تک راجوری کی سویٹ شاپس پر گلاب جامن اور موتی چور کے لڈو بننا بند نہیں ہوندے، میرا کچھ نہیں ہو سکدا۔''

آنیہ اور دلبر ماموں دونوں ہنسنے لگے۔

چند لمحے بعد آنیہ نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''ماموں! اس لڑکی نادیہ اور لڑکے ظہیر کے بارے میں کیا خبر ہے؟''

''ان کے بارے میں کوئی خبر نہیں اور وہ کہندے ہیں ناں کہ نو نیوز اِز گڈ نیوز۔ لگدا یہی ہے کہ وہ دونوں ابھی تک بچے ہوئے ہیں۔''

''کیا یہ بات ٹھیک ہے کہ راسو نے ہی ان دونوں کو بھگایا تھا؟''

''آہو دھی رانی! یہ بات تو اب کھل گئی ہے کہ اسی نے کڑی منڈے کو ایم پی اے ریاض کی کوٹھی کے پاس سے اٹھایا اور کسی محفوظ تھاں (جگہ) پر پہنچا دتا۔ وہ بھی جی دار منڈا ہے۔ اس نے زباب منزل میں ایک لنگڑی کڑی کو بھی پناہ دے رکھی ہے۔ کہندے ہیں کہ اس کے پتی کو بھی پولیس نے ہی مارا تھا، یا شاید فوج نے۔ اس کڑی کا نام سدرہ ہے۔''

''وہ...... سدرہ اب کہاں ہے؟''

''جہاں تک میری جانکاری ہے، وہ بھی اب زباب منزل میں نہیں ہے۔ پہلے شاید اسپتال میں تھی، پھر وہاں سے بھی چلی گئی۔ لگدا ہے، پولیس کے ڈر سے کہیں غائب ہو گئی ہے۔''

''اس...... راسو کے بارے میں اب کیا خبر ہے؟''

''سنا ہے کہ پولیس اس کے لیے چھاپے مار رہی ہے۔ یہ بھی کہندے ہیں کہ اس کا کسی گروپ وغیرہ سے سمبندھ ہے۔ باقی رب جانے۔ خیرو بتا رہا تھا کہ تین چار دن کے لیے شہابی حیدر بھی گرفتار رہا ہے...... پھر چینل والوں نے اُسے چھڑایا تھا۔''

ماموں دلبر سے گفتگو ختم کرنے کے بعد آنیہ سوچ میں ڈوب گئی۔ پتا نہیں کیوں اس کا دھیان بار بار راسو کی طرف جا رہا تھا۔ زباب منزل میں راسو نے جس طرح زبردستی اسے اپنا مہمان بنایا تھا، وہ بھی اس کے حافظے پر نقش تھا۔ پھر اس کے موبائل میں اس کی تصویر؟ عجیب ایب نارمل رویہ تھا اس کا۔ اس رویّے میں اور اس کی شخصیت میں ایک طرح کی پراسراریت شامل تھی۔ اس کی گرفتاری کے بعد آنیہ کو بجا طور پر خدشہ تھا کہ کہیں اس سارے معاملے میں اس کا نام بھی نہ آ جائے، کیونکہ راسو کی گرفتاری کے وقت وہ زباب منزل میں موجود تھی مگر اس حوالے سے خیریت ہی رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ راسو نے پولیس کو کسی کے بارے میں کچھ بتا کر نہیں دیا تھا۔

اچانک آنیہ کا دھیان اس ڈائری کی طرف چلا گیا جو اس نے راسو کے بیڈ روم کے ایک چور خانے میں دیکھی تھی۔ آنیہ کے اسمارٹ فون میں اس ڈائری کے تقریباً سارے اوراق کی تصاویر موجود تھیں۔ دو ڈھائی ماہ بعد اس ڈائری کا خیال آیا تو آنیہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ وہ کیا تحریر تھی۔ اس ڈائری کی تصاویر اتارتے وقت آنیہ نے سوچا تھا کہ وہ نہار سے یہ تحریر پڑھوانے کی کوشش کرے گی (وہ مشکل اور ناقابلِ فہم تحاریر پڑھنے کا ذوق رکھتی تھی) مگر پھر جالندھر آ کر یہ بات آنیہ کے ذہن سے نکل گئی تھی۔

اس نے فون کی گیلری میں جا کر اس ڈائری کا عکس دیکھا اور اس کے ساتھ ہی اسے یاد آیا کہ کل نہار بھی امرتسر سے جالندھر آ رہی ہے۔ اسے یہاں کی لائبریری میں کوئی کام تھا۔ یہ اچھا موقع تھا کہ اسے ڈائری کی یہ تحریر دکھائی جاتی۔

☆☆☆

اگلا روز بے حد انکشاف انگیز اور سنسنی خیز ثابت ہوا۔ نہار سے ملاقات ہوئی۔ آنیہ نے اسے دلبر ماموں سے ہونے والی ساری گفتگو سے آگاہ کیا اور پھر ڈائری کی وہ نقل بھی دکھائی۔ کافی غور و خوض کرنے کے بعد بھی نہار اسے سمجھ نہیں سکی۔

اس نے کہا۔ ''یہ تو طے ہے کہ یہ کوئی قدیم طرزِ تحریر نہیں۔ یہ نیا ہے...... بلکہ شاید جدید ہے۔ کسی رائج زبان میں ایک 'کلیے' کے تحت بہت سے اضافی حروف شامل کر کے اسے ناقابلِ فہم بنا دیا گیا ہے۔ مثلاً اگر ہم اردو کے لفظ کتاب

www.pakistanipoint.com

میں ف کا جا بجا استعمال کریں تو کتاب کے بجائے ''کف تقابف'' بن جائے گا۔''
پھر وہ ایک دم چونکی اور اس کے چہرے پر دبا دبا جوش نظر آیا۔ اپنے لمبے بالوں کو ہلکورا دے کر بولی۔ ''ہاں، ایک کام ہوسکتا ہے آنیہ جانی۔''
''وہ کیا؟''
''آؤ میرے ساتھ۔'' وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''ایک جگہ چلنا ہے۔ تم گاڑی نکالو۔''
صرف بیس منٹ بعد وہ دونوں ایک بنگلا نما گھر کے ڈرائنگ روم میں فرنچ کٹ داڑھی والے ایک پروفیسر صاحب کے رُوبرو بیٹھی تھیں۔ زیڈ اے صدیقی نام کے یہ پروفیسر چند سال پہلے نہار کے ٹیچر رہ چکے تھے اور لسانیات کے ماہر تھے۔ نہار کور انہیں ڈائری کی نقل دکھا چکی تھی۔
پروفیسر صاحب کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ انہیں تحریر کے ''کی ورڈز'' کا پتا چل گیا ہے اور وہ ان کی سمجھ میں آرہی ہے۔ ان کے سرخ وسپید چہرے پر بتدریج ہیجان کے تاثرات پیدا ہوگئے۔ پڑھنے کے دوران میں انہوں نے تین چار مرتبہ اپنی عینک کے اوپر سے نہار اور آنیہ کو دیکھا۔ پندرہ بیس صفحات دیکھنے کے بعد انہوں نے موبائل کی اسکرین سے نگاہ ہٹائی اور سنسنی خیز نگاہوں سے نہار اور آنیہ کو دیکھتے ہوئے بولے۔ ''آنیہ! آپ مجھے ٹھیک بتائیں، یہ ڈائری آپ کو کہاں ملی؟''
آنیہ نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''میں نے آپ کو بتایا ہے ناں سر! راجوری کی ایک بس میں سفر کرتے ہوئے کوئی شخص اسے اپنی نشست پر بھول گیا یا پھر اس سے گر گئی۔ جب کوئی اس کا دعویدار نہیں بنا تو میں نے اٹھالی۔ میرا خیال تھا کہ...... اس پر ایڈریس وغیرہ ہوگا اور...... میں اسے مالک تک پہنچادوں گی لیکن اس کا کوئی لفظ میرے اور نہار کے پلّے نہیں پڑا۔''
صدیقی صاحب عجیب نظروں سے آنیہ اور نہار کی طرف دیکھتے رہے پھر ٹھہرے اور سنسناتے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''کشمیر کے بارے میں تم کیا جانتی ہو؟''
''وہی سر...... جو سارے جانتے ہیں۔ کشمیر ایک متنازعہ علاقہ ہے۔ اس کا کچھ حصہ پاکستان کے پاس اور زیادہ تر انڈیا کے پاس ہے۔ پاکستان کا تقاضا ہے کہ یو این او کی قراردادوں کے مطابق وہاں رائے شماری ہونا چاہیے۔''
''اس کے سوا اور کچھ نہیں جانتی ہو؟'' صدیقی صاحب نے بیک وقت دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔
نہار بولی۔ ''سر! بہت سے لوگوں کا ماننا ہے کہ کشمیریوں کو حق خودارادیت دینا چاہیے لیکن بھارت سرکار ایسا نہیں چاہتی۔ شاید ہمارے نیتاؤں کا خیال ہے کہ جس طرح انہوں نے خالصتان کے لیے سکھوں کی تحریک کو مار کوٹ کر دبالیا اس طرح کشمیری بھی ایک روز ہمت ہار جائیں گے۔''
خالصتان کی بات کرتے ہوئے نہار کور کے لہجے میں ایک طرح کی تپش نمودار ہوگئی۔ شاید اسے 1984ء کے خونی واقعات یاد آگئے تھے۔
''تمہاری اس بارے میں کیا رائے ہے آنیہ؟'' صدیقی صاحب نے پوچھا۔
وہ سمجھ نہیں پارہی تھی کہ پروفیسر صاحب نے اچانک یہ سیاسی گفتگو کیوں چھیڑ دی ہے، وہ بولی۔ ''یہ بات تو طے ہے جناب! کہ دونوں ایٹمی ملکوں کے درمیان کشمیر ایک جلتا ہوا مسئلہ ہے۔ اس کو ایک نہ ایک دن ''سیٹل'' ہونا ہے مگر بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح میں بھی شدت پسندی کی قائل نہیں ہوں۔ چاہے یہ شدت پسندی آزادی چاہنے والے مسلمانوں کی طرف سے ہو یا آزادی کی تحریک کو دبانے والی انڈین فورسز کی طرف سے۔ دونوں فریقین کو تحمل سے کام لینا چاہیے۔ کشت وخون اور تشدد کسی مسئلے کا حل نہیں۔ آخر تو بات چیت کی میز پر ہی آنا پڑتا ہے۔''
پروفیسر صدیقی عجیب انداز سے مسکرائے بولے۔ ''آگ کو دور سے دیکھ کر اور اس کی خصوصیات کے بارے میں لیکچر سن کر اس کی صحیح تپش اور اذیت ناکی کا اندازہ نہیں ہوتا۔ یہ اندازہ آگ میں ہاتھ ڈالنے سے ہوتا ہے۔''
''آ...... آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں سر؟'' آنیہ نے پوچھا۔
وہ گہری سانس لے کر بولے۔ ''مجھے نہیں پتا کہ تم دونوں نے مجھے اس ڈائری کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے، وہ کتنا صحیح ہے لیکن...... شاید تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو کہ یہ ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے جس نے کشمیر کاز کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر رکھی ہوئی ہے۔ وہ اس کے لیے ہر حد تک جانے کو تیار ہے۔ وہ ایسی اسٹیج پر ہے جہاں موت اور موت سے جڑے ہوئے سارے خوف بے معنی ہوجاتے ہیں۔''
''آ...... آپ کس کی بات کررہے ہیں سر؟'' آنیہ نے پوچھا۔
صدیقی صاحب نے اسکرین پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''اس کا نام راسم ہے۔ اسے جاننے والے اسے راسو کے نام سے بھی پکارتے ہیں۔''

آنیہ اور نہار نے سکتے کی سی کیفیت محسوس کی۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور تب ایک بار پھر صدیقی صاحب کی طرف دیکھنے لگیں۔

وہ بولے۔ ”اس ڈائری کا ایک حصہ راسو کی اپنی زندگی کے حالات سے وابستہ ہے اور یہ کافی ڈرامائی تاثر لیے ہوئے ہے۔ شاید یوں کہنا چاہیے کہ اس حصے میں راسو نے اپنی زندگی کے ایک اہم ترین راز کو قلمبند کیا ہے...... دوسرا حصہ ان حالات کے بارے میں ہے جنہوں نے اسے ایک عام کشمیری نوجوان کے بجائے ایک سر بکف فریڈم فائٹر بنایا ہے۔ یہ بھی ایک دل ہلا دینے والی رُوداد ہے۔“ صدیقی صاحب ایک بار پھر ڈائری کے اوراق میں کھو گئے۔

آنیہ کو اپنی نرم ہتھیلیوں پر پسینے کی نمی محسوس ہوئی۔ اس نے کشمیر کے فریڈم فائٹرز کے بارے میں کافی کچھ سن رکھا تھا۔ ان میں اکثر ایسے نوجوان تھے جن کے قریبی عزیز اور پیارے کشمیر میں لگی آگ کی نذر ہوئے تھے یا پھر بُری طرح متاثر ہوئے تھے۔ اب ان کشمیری مجاہدوں نے پہاڑوں میں نشیمن بنا رکھے تھے اور گاہے بگاہے انڈین فورسز کو للکارتے تھے۔ کچھ لوگ ان کے اس عمل کو درست کہتے تھے اور کچھ کا خیال تھا کہ کشمیر میں آزادی کا مطالبہ کرنے والوں کو یہ جدوجہد مسلح لڑائی میں نہیں بدلنی چاہیے۔ کشمیریوں کے حقِ خودارادیت کی حامی ہونے کے باوجود آنیہ بھی پُرامن جدوجہد کی حامی تھی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ کسی خطرناک کشمیر فریڈم فائٹر سے نہ صرف ملے گی بلکہ اس کے ساتھ ایک چار دیواری میں بند ہونے کے بعد اس کی ذاتی زندگی میں بھی جھانکے گی۔ اسے جھرجھری سی آ گئی۔

پروفیسر صدیقی مسلسل ورق گردانی میں معروف تھے۔ انہوں نے کہا۔ ”ڈائری کے آخری حصوں میں لکھنے والے نے بہت محتاط انداز اختیار کیا ہے۔ میری ناقص معلومات کے مطابق اس ڈائری کی زبان وہ ہے جو برسوں پہلے کشمیری مجاہدین نے باہمی پیغامات اور معلومات کے تبادلے کے لیے ایجاد کی تھی۔ اس خفیہ زبان کے باوجود راسم عرف راسو نے کئی جگہ کوڈ ورڈز کا استعمال کیا ہے......“ وہ تحریر پر نگاہیں جماتے ہوئے بولے۔ ”بار بار کسی فاروق کا ذکر ہے...... یہ نوجوان یقیناً راسو کا قریبی دوست تھا۔ کسی امیر گھرانے کی برہمن لڑکی کا ذکر بھی ہے...... پھر...... سدرہ نام کی ایک نہایت خوش شکل لڑکی کا ذکر ہے۔ اس کی ایک ٹانگ اس کے ظالم شوہر نے توڑ ڈالی تھی...... شوہر کا نام بھی کوڈ ورڈز میں ہے۔ یہ سدرہ نامی لڑکی اپنے شوہر کے ستم سے جان چھڑانا چاہتی تھی۔ اس نے غالباً گھر سے بھاگنے کی کوشش کی اور ٹانگ گنوانے کی سزا پائی۔“

آنیہ کی نگاہوں کے سامنے وہ تصویریں گھوم گئیں جو اس نے راسو کے بیڈ کے نیچے چور خانے میں دیکھی تھیں۔ ان میں سے ایک تصویر کے اندر حیران کن طور پر مسلمان سدرہ کرنل اروڑا کے ساتھ اگنی کے پھیرے لے رہی تھی۔ مطلب یہ کہ اروڑا ہی اس کا شوہر تھا اور اسی نے سدرہ کو ٹانگ سے معذور کیا؟ یہ کوئی اُلجھی ہوئی بے مہر کہانی تھی۔

صدیقی صاحب بدستور تحریر کے پیچ وخم میں کھوئے ہوئے تھے۔ پُرسوچ انداز میں بولے۔ ”ڈائری کے اس حصے میں لکھنے والے نے زیادہ اشاروں کنائیوں سے ہی کام لیا ہے۔ یہ فاروق، راسو کا بہت گہرا دوست تھا۔ یہ کسی بڑی مصیبت کا شکار ہوا۔ غالباً یہ کشمیر کی تحریکِ آزادی میں شامل ہونے کی وجہ سے کسی حادثے کی نذر ہوا۔ اور یہی وہ موڑ ہے جس کے بعد راسو کی زندگی کا رخ بھی تبدیل ہوا...... تحریر میں کئی جگہ کسی کھلونے کا ذکر بھی ہے جو راسو گراں قیمت پر اپنے کسی شناسا سے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ یہ کھلونا اپنے کسی پیارے کو اس کی سالگرہ پر دینا چاہتا ہے، لگتا ہے کہ یہ کھلونا کوئی ہتھیار ہی ہے جس کی راسو کو ضرورت رہی ہے۔“

آنیہ اور نہار بڑی توجہ سے صدیقی صاحب کی باتیں سن رہی تھیں۔ وہ جلد ہی ڈائری کے پہلے حصے کی طرف آ گئے۔ یہ راسو کی ذاتی زندگی کے ابتدائی واقعات تھے اور یہ صراحت سے بیان کیے گئے تھے۔ صدیقی صاحب نے کہا۔ ”یہ ایک نزے دار کھا ہے اور اس میں ایک طرح کا ”کہانی پن“ بھی ہے۔ کیا تم سننا پسند کرو گی؟“

”ضرور۔“ آنیہ کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

صدیقی صاحب نے تحریر پر نظریں جمائے جمائے کہنا شروع کیا۔ ”یہ ایک طرح سے اس راسو نامی نوجوان کی حیات کا ایک اہم ترین راز ہے۔ اس نے یوں لکھا ہے...... ماں! میری یہ تحریر ایک خط کی طرح ہے۔ وہ خط جو میں تمہیں کبھی پوسٹ نہیں کروں گا۔ ماں! میں برسوں تیرے آس پاس رہا، تیرے ساتھ رہا پر تجھے ماں نہ کہہ سکا۔ پتا ہی نہیں چلا کہ تو ماں ہے اور میری رگوں میں تیرے جسم کا خون دوڑتا ہے...... اور جب اس بات کا پتا چلا تب بہت دیر ہو چکی تھی...... اور مجھے یہ راز بتایا بھی کس نے؟ اس نے جسے میں ہمیشہ ماں سمجھتا رہا۔ وہ بھی مجھے اپنا بیٹا کہتی رہی لیکن پتا نہیں کیوں ماں...... جو کشش میں نے تیری طرف محسوس کی شاید اُس کی طرف بھی نہ کی۔ اس کے ضمیر پر بوجھ تھا ماں۔ اور پھر

www.pakistanipoint.com

میری اس غیر حقیقی ماں نے اس بوجھ کے سبب ایک دن مجھے سب کچھ بتادیا۔ ان دنوں وہ بہت علیل تھی۔ اس نے مجھ سے کچھ بھی نہ چھپایا۔ میں نے بھی سب کچھ جان لیا مگر یہ سب بے فائدہ ہوگیا۔ میں تب تک بہت دور نکل چکا تھا...... ہاں ماں! میں تجھ سے بہت دور ہوں۔ اب تجھے اپنا بیٹا ہونے کا صدمہ نہ ہی دوں تو اچھا ہے۔ کیا پتا کب موت کے سفر پر چل نکلوں، تو پھر ٹھیک ہے نا۔ یہ راز میرے سینے میں ہی رہنے دو...... تم کبھی نہ سنو...... ہاں تم کبھی نہ سنو...... اور میں کبھی نہ بتاؤں کہ میرے ساتھ کیا ہوا؟...... تجھے کبھی معلوم نہ ہو کہ میں جس دن تیری کوکھ سے پیدا ہوا، اسی دن مجھے تجھ سے دور کر دیا گیا۔ دراصل...... میری غیر حقیقی ماں کے اصل بچے کے دل کو پیدائشی عارضہ لاحق تھا۔ وہ دل کو دھڑکانے والے سگنلز کی کمزوری کا مریض تھا۔ میری غیر حقیقی ماں اتنی استطاعت نہیں رکھتی تھی کہ مستقبل میں اس کا علاج کرا پاتی، اس پر ہزاروں لاکھوں خرچ کرتی۔ اسے بجا طور پر اندیشہ تھا کہ مستقبل قریب میں اس کا بچہ مرجائے گا۔ اس نے اسپتال میں اپنی دوست نرس کی مدد سے اپنے نوزائدہ بچے کو ایک امیر، باحیثیت ماں کے بچے سے بدل دیا۔ اس کی کوشش کامیاب رہی۔ اس نے امیر ماں کے بچے کو اپنا بنا کر پالا...... اور وہ راسو بن گیا۔ اب تو سمجھ گئی ہوگی ماں! کہ اس غریب ماں کا بچہ کون تھا اور وہ باحیثیت ماں کون تھی؟ وہ بچہ شہباز حیدر تھا۔ میرا دوست...... میرا بھائیوں جیسا دوست شہابی حیدر...... اور وہ باحیثیت ماں تو تھی۔

...... ہاں، اب یہ سب کچھ راز ہی رہنے دو ماں۔ اسی میں تیرا اور میرا بھلا ہے۔

آنیہ اور نہار صُمٌّ بکمٌ سن رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ کسی ڈرامے یا فلم کی کہانی ہے مگر قرائن بتا رہے تھے کہ یہ جیتی جاگتی زندگی کی ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ کہانیاں بھی تو ہماری زندگی میں سے ہی پھوٹتی ہیں۔ پروفیسر زیڈ اے صدیقی نے چند مزید اوراق ''اسکپ'' کیے اور پھر ایک جگہ رکتے ہوئے بولے۔

''یہاں راسم عرف راسو نے لکھا ہے...... کچھ عرصہ بعد میری غیر حقیقی ماں (جسے آپ سب لوگ آیا خالہ کہتے ہیں) ایک ملازمہ کی حیثیت سے زباب منزل میں آگئیں۔ اس وقت میں چند ماہ کا تھا۔ یہاں بھی انہوں نے ناانصافی کی۔ اپنا بچہ تو ہر وقت اپنی نگاہوں کے سامنے رکھا مگر آپ کے بچے کے بارے میں آپ کو کچھ پتا نہ چلا...... یہ بچہ آپ کے گھر میں آپ کی نگاہوں کے سامنے ہی ایک بے سمت زندگی گزارتا رہا شاید یہی زندگی کی بوالعجبی ہے۔''

اس سے آگے چند چھوٹے چھوٹے واقعات کا ذکر تھا جن میں راقم کی محرومی اور یاسیت کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ اس کے نیچے چند پُردرد شعر لکھے تھے۔

اس رُوداد کے آخری حصے کا ایک پیرا صدیقی صاحب نے سنایا۔ کہنے لگے۔ ''اپنی ماں زباب بیگم کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے لکھا ہے...... میری غیر حقیقی ماں (یعنی زباب منزل کی آیا خالہ) آپ سب کے سامنے بھی اپنے جھوٹ کا اعتراف کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن میں نے اسے اپنے سر کی قسم دے کر منع کر دیا ہے۔ اب یہ راز ہمیشہ میرے اور اس کے درمیان رہے گا۔ میں جانتا ہوں ماں! میں نے ٹھیک کیا ہے۔ میں تجھے ایسے ملاپ کی خوشی کیوں دوں جس کے اوپر جدائی کا گہرا سایہ ہے۔ میں اس جدائی کو جدائی ہی رہنے دوں تو ٹھیک ہے...... تمھیں یہ خط لکھ کر میرے دل کو کچھ نہ کچھ سکون مل گیا ہے۔ کاش میں یہ خط تمھیں پہنچا بھی سکتا......''

صدیقی صاحب بول رہے تھے۔ ان کی آواز آنیہ کے کانوں میں جیسے کہیں بہت دور سے پہنچ رہی تھی۔ وہ کسی اور ہی کیفیت میں تھی۔ ''شیر بچے'' کی نظرانداز کی ہوئی تصویر اب ایک بار پھر اس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ اب اس کے رنگ پھر نکھر آئے تھے۔ اس کا دل پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ بالآخر ''دھوکا'' اختتام پذیر ہوا۔ بالآخر ایک ILLUSION کی موت ہوئی۔ بالآخر وہ اصل شخص تک پہنچ گئی ہے۔

اسے اپنے اس یقین پر ہمیشہ بہت ''یقین'' رہا تھا کہ شیر بچے کی موجودہ بود کے افراد کو وہ اعلیٰ اور باوقار مقامات پر دیکھے گی۔ ان کی آنکھوں میں اس دلیری اور جرأت مندی کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور لشکارے مارتا ہوگا، جو شیر بچے کی آنکھوں میں چمکتی تھی جو بہ زبان خاموشی پکار کر کہتی تھی...... تم ظلم ہو تو میں بغاوت ہوں۔ تم جبر ہو تو میں ایک دیوانی مزاحمت ہوں۔ مجھے اپنی ہمت طاقت کے مطابق تمہارا راستہ روکنا ہے...... یہی وجہ تھی کہ جب راجوری میں شہابی حیدر کا اصل چہرہ اس کے سامنے آیا تھا تو اسے لگا تھا کہ اس نے برسوں تک رنگ آمیزی کر کے اپنے پردۂ تصور پر جو ایک عالیشان تصویر بنائی تھی اس کے سارے رنگ کچے نکلے ہیں، بارش میں دھل کر ناپید ہوگئے ہیں...... مگر آج کئی ماہ بعد اس ڈائری کے اوراق نے ایک انکشاف کر دیا تھا۔ اگر یہ انکشاف درست تھا تو پھر حقیقت یہ تھی کہ وہ جس شخص کو دیکھ کر اتھاہ مایوسیوں میں ڈوب گئی تھی...... وہ تو اس ساری کہانی میں اجنبی تھا۔ جذبوں اور حوصلوں میں گندھی ہوئی اس صد سالہ

www.pakistanipoint.com

داستان سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا اور جس کا تعلق تھا...... جس کی آنکھوں میں اصل شجاعت کی چنگاریاں چمکتی تھیں اور جس کے سینے کو مزاحمت کی بے مثل آگ وراثت میں ملی تھی، وہ کوئی اور نہیں راسم تھا۔ راسم عرف راسو...... جلیانوالا باغ اور اسد اللہ سے شروع ہونے والی کہانی، چلتے چلتے کشمیر اور راسم تک آ پہنچی تھی۔ کہانیاں ایسے ہی اپنے ہونے کا ثبوت دیتی ہیں۔ جذبے ایسے ہی نسل در نسل سفر کرتے ہیں۔ ''شیر بچے'' کا پوتا راسم ویسے ہی مقام پر پایا جارہا تھا جہاں اسے ہونا چاہیے تھا۔ آنیہ کے نزدیک یہ ایک علیحدہ سوال تھا کہ وہ جس مقام پر ہے وہ موجودہ حالات میں اس کے لیے ٹھیک ہے یا نہیں؟

صدیقی صاحب کی آواز نے آنیہ کو خیالوں سے چونکایا۔ وہ پُرسوچ لہجے میں بولے۔ ''لگتا ہے کہ اس راسو نام کے نوجوان کی شخصیت دو حصوں میں بٹ چکی ہے۔ ایک روپ میں وہ ایک عام کشمیری نوجوان ہے۔ انڈین فورسز سے نفرت کرنے والا، ان کے خلاف پوسٹر لگانے والا، جلوس نکالنے والا اور ان کی گاڑیوں پر پتھراؤ کرنے والا۔ لیکن اس کا دوسرا روپ زیادہ خطرناک ہے۔ یقیناً وہ مسلح جدوجہد کا حصہ بن چکا ہے...... اور اپنے اندر خوفناک ارادے پال رہا ہے...... اور غالباً یہ سب کچھ اس کے دوست فاروق کو پیش آنے والے نامعلوم واقعے کے بعد ہوا ہے۔''

وہ ڈائری کے اوراق پر نظر دوڑاتے رہے پھر یکایک اُن کے چہرے پر سنسنی نظر آئی۔ انہوں نے موبائل کی اسکرین پر کچھ سطور کو غور سے پڑھا اور بولے۔ ''یہ دیکھو، یہ جس کھلونے کا اس تحریر میں کئی بار ذکر ہے، یہ بات یقینی ہے کہ یہ ایک ہتھیار ہے...... اور ہتھیار بھی کوئی عام نہیں۔ یہاں، یہ اس کونے میں ایک نمبر لکھا ہوا ہے۔'' صدیقی صاحب نے آنکھیں سکیڑ کر پڑھا۔ ''M2-HB...... مجھے لگتا ہے کہ یہ کسی مشہور آٹومیٹک رائفل کا نمبر ہے۔''

انہوں نے اپنا اسمارٹ فون نکالا اور ''گوگل'' کیا۔ کچھ ہی دیر بعد اُن کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے۔ ''یہ دور تک مار کرنے والی ایک مشین گن ہے۔ قریباً ڈیڑھ پونے دو کلومیٹر تک یہ آسانی اپنے ہدف کو نشانہ بنا سکتی ہے۔ امریکا کی بنی ہوئی یہ مشین گن افغانستان کی جنگ میں بھی استعمال ہوتی رہی ہے۔ یقیناً مہنگی بھی ہوگی۔ پرانی ہوئی تو بھی خاصی قیمت کی ہوگی۔''

''یعنی...... یہ وہ کھلونا ہے جو یہ راسو حاصل کرنا چاہ رہا ہے؟'' آنیہ نے پوچھا۔

''چاہ ہی نہیں رہا بلکہ حاصل کر چکا ہے یا کرنے والا ہے۔ یہ نیچے ایک نوٹ لکھا ہوا ہے...... ش نے وعدہ کیا ہے کہ جولائی کی 31 تک کھلونا مجھے مل جائے گا۔ اس کا مطلب ہے میں سالگرہ پر تحفہ پیش کر سکوں گا۔'' صدیقی صاحب نے سر اٹھا کر آنیہ اور نہار کی طرف دیکھا اور بولے۔ ''آج کیا تاریخ ہے؟''

''2 اگست۔'' نہار نے جواب دیا۔

صدیقی صاحب نے نیچے کچھ اور سطور پر نگاہ دوڑائی اور تحریر کو ''ڈی کوڈ'' کرتے ہوئے بولے۔ ''راسو لکھتا ہے...... ایک دفعہ کھلونا مل جائے...... پھر ایک دیرینہ ارمان پورا ہو جائے گا...... بلکہ باقی کے ارمان بھی پورے ہو جائیں گے۔ چھوٹی چھوٹی کئی خوشیاں ہیں جن کے لیے دل ترس رہا ہے۔''

آنیہ اور نہار کی آنکھوں میں سراسیمگی جمع ہو رہی تھی۔ آنیہ نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ ''وہ کیا ارمان ہو سکتا ہے اور وہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں کیا ہیں؟''

''ظاہر ہے کہ وہ کچھ لوگوں پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوگا۔'' پروفیسر صدیقی بولے۔ ''یہ بات طے ہے کہ یہ شخص اب پُرامن جدوجہد کے بجائے مسلح جدوجہد کی طرف آچکا ہے۔ خطرناک زون میں قدم رکھنے والا ہے اور یہ کوئی اکیلا نہیں ہے۔ بہت سے کشمیری نوجوان اس راہ پر چل پڑے ہیں۔''

''اور نقصان بھی اٹھا رہے ہیں۔'' آنیہ نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ''یہ لوگ کیوں نہیں سمجھتے کہ انڈیا کی باقاعدہ فوج سے ٹکرا کر یہ اپنے مقاصد حاصل نہیں کر سکتے۔ قریباً ایک لاکھ لوگ اپنی جان کی بازی ہار چکے ہیں، اَن گنت گھرانے برباد ہو چکے ہیں۔ چند دن پہلے میں نیٹ کے ذریعے آنے والی ایک وڈیو دیکھ رہی تھی۔ انڈین فوج کی گولیوں سے چھلنی ہونے والے سیکڑوں مجاہدوں کی لاشیں ایک ڈھیر کی صورت میں پڑی تھیں۔ سب کے سب نوجوان تھے۔ کشمیری ماؤں کے لختِ جگر تھے۔ یہ لوگ کیوں مسلسل اس آگ کا ایندھن بن رہے ہیں۔ کیوں اس مسئلے کے حل کے لیے دوسرے راستے اختیار نہیں کیے جاتے؟ کیوں ٹیبل ٹاک اور مذاکرات کا وتیرہ اختیار نہیں کیا جاتا؟''

پروفیسر صدیقی نے عجیب نظروں سے آنیہ کی طرف دیکھا۔ ''میں تمہیں بتا رہا تھا کہ آگ کو دور سے دیکھ کر اس کی صحیح تپش اور اذیت ناکی کا اندازہ نہیں ہوتا، یہ اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب آپ کے جسم کا کوئی حصہ براہِ راست

www.pakistanipoint.com

آگ میں ہوتا ہے...... میں بھی ایک کشمیری ہوں۔ اسی جنت سے نکل کر یہاں آیا ہوں جو ایک جہنم ہے اور یہ جہنم تو برسوں سے تیار ہو رہی ہے۔ یہ شعلے 72 سال سے بھڑک رہے ہیں اور بلند تر ہو رہے ہیں۔ 1998ء میں میرا ایک کزن ان شعلوں میں زندہ جل چکا ہے اور یہ تو کشمیر میں بسنے والے تقریباً ہر ''مسلمان خاندان'' کی کہانی ہے۔ ہر خاندان میں کوئی نہ کوئی شہید پایا جاتا ہے۔ کوئی نہ کوئی لاپتا یا اپاہج موجود ہے۔''

آنیہ اور نہار خاموش بیٹھی تھیں۔ وہ آنیہ کی طرف دیکھ کر بولے۔ ''تم نے اپنی سوچ کے مطابق مذاکرات اور گفتگو کی بات کی ہے۔ ذرا چند لمحوں کے لیے تصور کرو۔ کشمیر کی ایک ٹھٹھری ہوئی شب ہے۔ لوگ اپنے گھروں میں دبکے ہوئے ہیں۔ چند فوجی ایک گھر میں داخل ہوتے ہیں۔ رائفلیں تان کر اہلِ خانہ کو ہراساں کرتے ہیں۔ ایک لڑکی کو ریپ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ کیا اس لڑکی کا باپ یا بھائی ان لوگوں سے مذاکرات کرے گا۔ نہیں، وہ اگر بندھا ہوا نہ ہوا، تو جا پڑے گا ان پر...... مارا جائے گا یا اتنا زدوکوب ہوگا کہ ہوش میں نہ رہے گا۔ یہاں گن پوائنٹ پر پامال کیا جا رہا ہے کشمیر کو۔ یہ بات مذاکرات اور گفتگو سے آگے نکل چکی ہے۔''

آنیہ افسردگی سے بولی۔ ''آپ کی بات اپنی جگہ درست ہے سر! مگر مسلح جدوجہد بھی تو کسی منظم حکمتِ عملی کے تحت ہونی چاہیے۔ چھوٹے چھوٹے گروپوں کی صورت میں جان گنوا دینا تو شاید...... دانشمندی نہیں ہے۔''

شاید یہ بحث آگے چلتی مگر پروفیسر صدیقی کے فون پر کال آ گئی۔ انہیں ایک سیمینار میں شرکت کے لیے یونیورسٹی جانا تھا۔ یہ نشست یہاں پر ختم ہوگئی۔

☆☆☆

اگلے چوبیس گھنٹے آنیہ کے لیے نہایت تہلکہ خیز تھے۔ وہ گھر واپس آ چکی تھی مگر اس کا دل و دماغ اس ڈائری کے انکشافات کے اندر جذب ہو چکا تھا۔ وہ کچھ اور سوچ ہی نہیں پا رہی تھی۔ ایک اتفاق کے تحت وہ ایک بہت بڑے راز کی امین بن چکی تھی اور وہ راز یہ تھا کہ راجوری کی زباب منزل میں جس کو زباب بیگم کا بیٹا سمجھا جاتا تھا، وہ ان کا بیٹا نہیں تھا۔ وہ (شہابی حیدر) آپا خالہ کا بیٹا تھا۔ زباب بیگم کا فرزند راسم تھا۔ راسم عرف راسو۔ اپنے کوہ پیما والد تیمور حیدر کی طرح نڈر اور اپنے دادا اسداللہ کی طرح موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے والا۔ وہ اس وقت شاید موت کی طرف ہی بڑھ رہا تھا۔ آنیہ کو یوں لگا جیسے ایک لاکھ شہیدوں کے لاشے ایک ساتھ اس کی نگاہوں میں ابھر آئے ہیں۔ قطار اندر قطار خونچکاں جسم...... اور ان میں سے ایک گولیوں سے چھلنی جسم راسم کا بھی ہے۔ وہ کیا کرنے جا رہا تھا؟ اس نے ایسا خطرناک ہتھیار کیوں حاصل کیا تھا؟ وہ کس کو مارنا چاہتا تھا۔ کس کو سالگرہ کا تحفہ پیش کرنا چاہتا تھا؟ کیا اس سارے معاملے کا تعلق اس کے دوست فاروق سے تھا؟ یا پھر...... وہ ٹانگ سے معذور لڑکی جس کو اس نے پناہ دے رکھی تھی؟ ان گنت سوالات آنیہ کے ذہن میں کلبلا رہے تھے۔

اسے لگا کہ اسے راسو کے لیے کچھ کرنا چاہیے...... کل ڈائری کے اوراق سے اسے اور نہار کو بہت سی اہم معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک نہایت اہم انفارمیشن کسی ''چار کوٹھیاں'' کے حوالے سے بھی تھی۔ کھلونے، فاروق اور سالگرہ کی طرح ''چار کوٹھیاں'' کا لفظ بھی تحریر میں تین چار مرتبہ آیا تھا۔ آنیہ اور نہار کی طرح صدیقی صاحب کا بھی خیال تھا کہ یہ راسو کا کوئی خفیہ ٹھکانا یا پناہ گاہ ہوسکتی ہے۔ اب آنیہ کو یاد آ رہا تھا کہ جن دنوں وہ دنیدھر فورٹ میں پینٹنگز بنا رہی تھی اس نے کسی سے اس ''چار کوٹھیاں'' کا نام سنا تھا۔ یہ جگہ یقیناً راجوری میں ہی کہیں تھی۔

آنیہ کے اندر ایک عجیب سی کیفیت تھی جسے وہ خود بھی کوئی نام نہیں دے پا رہی تھی۔ اس کے اندر کی سیلانی روح اسے کچھ کرنے پر اُکسا رہی تھی اور پھر اس نے فیصلہ کر لیا جب وہ ایک بار فیصلہ کر لیتی تھی تو پھر اس پر مضبوطی سے جم جاتی تھی۔ اگلے ہی روز اس نے پاپا کو قائل کر لیا کہ وہ راجوری کے فورٹ میں اپنا ادھورا کام مکمل کرنے کے لیے واپس جانا چاہتی ہے۔''

''نہار بھی جا رہی ہے؟'' پاپا خورشید عالم نے پوچھا۔

''نہیں جی، اب اسے چھٹی ملنا مشکل ہے لیکن میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ماموں دلبر موجود ہیں نا، ان سے کل بات ہوئی ہے۔ بس ماما کی طرف سے ذرا ڈانٹ کا خطرہ ہے۔''

''کوئی بات نہیں، اسے میں سنبھال لوں گا۔'' وہ مسکرائے۔

وہ اس نظریے کے حامی تھے کہ جوان بچوں پر کوئی روک ٹوک نہیں ہونی چاہیے۔ بس انہیں اچھے بُرے کا شعور دے دیا جائے۔ اس کے بعد انہیں اپنے راستوں کا انتخاب کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

☆☆☆

www.pakistanipoint.com

قریباً ڈھائی ماہ بعد آنیہ ایک بار پھر راجوری کی فضاؤں میں تھی۔ اس دفعہ وہ اکیلی آئی تھی۔ اس کے لیے اطمینان کی ایک بات یہ بھی تھی کہ آج کل شہابی حیدر راجوری میں موجود نہیں تھا۔ وہ نیو دہلی جا چکا تھا۔ وہاں ایک چینل میں نوکری کر رہا تھا۔ پچھلے ڈھائی تین مہینے میں وہ آنیہ کی طرف سے پوری طرح مایوس ہو چکا تھا۔ اب تو ایک ماہ سے اس سے کوئی رابطہ بھی نہیں ہوا تھا...... بس کبھی کبھی نہار سے ہیلو ہائے کر لیتا تھا۔ غالباً وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اس بات کے قائل ہوتے ہیں...... تو نہیں اور سہی...... اور نہیں اور سہی۔

دلبر ماموں نے ہمیشہ کی طرح خوش دلی سے آنیہ کا استقبال کیا۔ بہرطور ان کے چہرے پر ملال کے موہوم سائے بھی تھے۔ یقیناً یہ یہاں کے کشیدہ حالات کے حوالے سے تھے۔ راجوری سے ''پلواما'' کا فاصلہ 150 کلومیٹر سے زیادہ نہیں تھا...... پلواما اور سری نگر وغیرہ میں جو آگ لگی ہوئی تھی، اس نے ہر باضمیر شخص کو رنجور کر رکھا تھا۔ نوجوان بچے مر رہے تھے...... اپاہج اور لاپتا ہو رہے تھے۔ چادر اور چار دیواری پامال ہو رہی تھی۔ وادیِ جنت نظیر پر قابض قوتیں ہر مزاحمت کو کچل رہی تھیں۔

ان حالات میں دلبر سنگھ صاحب کے اپنے پرانے زخم بھی تازہ ہو گئے تھے۔ رات کو کھانے کے بعد انہوں نے دربار صاحب پر ہونے والے خونی حملے کی بات کی اور سکھوں کے اس قتلِ عام کی بات کی جو اندرا گاندھی کے قتل کے بعد ہوا۔ وہ کشمیر کو انڈیا کے سارے مظلوموں اور حریت پسندوں کے لیے ایک ٹیسٹ کیس قرار دے رہے تھے۔

بہرحال آنیہ نے اس حوالے سے کوئی بات نہیں کی اور بس دلبر ماموں کی ہاں میں ہاں ملاتی رہی۔ اس نے انہیں یہی باور کرایا کہ وہ اپنی ادھوری پینٹنگز مکمل کرنے کے لیے دوبارہ یہاں آئی ہے۔

تیسرے روز وہ ''چار کوٹھیاں'' نامی جگہ کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو گئی۔ ایک رکشے والے نے بتایا کہ یہ شہر کے اندر ایک رہائشی کالونی کا بس اسٹاپ ہے۔''

''یعنی یہاں کوٹھیاں وغیرہ نہیں ہیں؟''

''کوٹھیاں تو ہیں میڈم جی۔ اسی کی وجہ سے تو اسٹاپ کا نام پڑا ہے۔ انگریزوں کے زمانے کی کوٹھیاں ہیں، اب وہاں گودام شودام بنے ہوئے ہیں۔''

آنیہ اسی رکشے پر بیٹھی اور چار کوٹھیاں اسٹاپ پر پہنچ گئی۔ اس کی دھڑکن بڑھ چکی تھی۔ ایک طرح کے خطرے کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ وہ فی الحال صرف احتیاط سے یہاں کا جائزہ لینا چاہتی تھی۔

یہ علاقہ رہائشی تھا مگر رہائشی علاقے کے ساتھ ہی ایک بڑی مارکیٹ بھی موجود تھی بلکہ یہ کئی چھوٹی چھوٹی مارکیٹیں تھیں۔ چاروں کوٹھیاں درمیانے سائز کی تھیں اور کافی پرانی تھیں۔ ان میں فرشی ٹائلز اور سینیٹری وغیرہ کے سامان کے گودام بنے ہوئے تھے۔ کیا ان گوداموں میں سے ہی کسی گودام میں راسو موجود ہوگا۔ ایک بار تو اس کا دل چاہا کہ آگے بڑھے اور کسی کوٹھی کے گیٹ پر دستک دے کر سن گن لینے کی کوشش کرے مگر اس میں سنگین خطرات تھے۔ کچھ دیر بعد وہ واپس چلی آئی۔ وہ پچھلے چار پانچ روز میں درجنوں بار راسو کے پرانے فون نمبر پر ٹرائی کر چکی تھی مگر وہ بند ہی ملتا تھا۔ ماموں دلبر کے گھر آ کر اس نے ایک بار پھر کوشش کی۔ نمبر بند جا رہا تھا۔

اگلے روز وہ مجبوراً پینٹنگ کے سامان کے ساتھ فورٹ جا پہنچی۔ آج اسے یہاں راجوری میں چوتھا روز تھا۔ دلبر ماموں کو شبہ ہو سکتا تھا کہ اس نے اب تک پینٹنگ شروع کیوں نہیں کی۔ قلعے میں پینٹنگ کرتے ہوئے اسے ایک ڈیڑھ گھنٹا ہی ہوا تھا کہ ہیلمٹ پہنے ہوئے ایک شخص اس کے پاس آن کھڑا ہوا۔ اس نے دھیان سے دیکھا اور کسی حد تک پہچان گئی۔ وہ راسو کا دوست راجا تھا۔ راسو کے اسنوکر کلب کے ساتھیوں میں سے تھا۔

رسمی کلمات کے بعد وہ بولا۔ ''آپ کو دوبارہ یہاں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اور کون ہے آپ کے ساتھ؟''

''اس بار اکیلی ہی آئی ہوں۔'' آنیہ بولی۔ ''اور...... وہ...... راسو صاحب آج کل کہاں ہوتے ہیں؟'' آنیہ نے عام سے لہجے میں پوچھا۔

''آپ کو پتا ہی ہے، اس پر کیس وغیرہ کا چکر ہو گیا تھا۔ آج کل وہ لاپتا ہے...... ویسے آپ کیوں پوچھ رہی ہیں اس کے بارے میں؟'' اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''بس یونہی...... شہابی حیدر بھی آج کل راجوری میں نہیں ہے نا۔''

وہ اسٹول گھسیٹ کر اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اس کی باتوں سے آنیہ کو صاف پتا چل گیا کہ وہ اسے شک کی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ یہ جاننا چاہ رہا ہے کہ وہ کس کے ساتھ راجوری آئی ہے اور اس وقت اس کے اردگرد کوئی اور بندہ تو موجود نہیں۔ آنیہ کے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔ اسے لگا کہ کل ''چار کوٹھیاں'' کے قریب اس کی موجودگی کو نوٹ کیا گیا ہے اور یہ راجا نامی شخص یہاں آ موجود ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ

www.pakistanipoint.com

بھی تھا کہ وہ کل ٹھیک جگہ پر پہنچی تھی۔

آخر میں راجا بولا۔ ''راسو بھائی اس وقت کسی نامعلوم جگہ پر موجود ہیں۔ پر میں کوشش کر کے ان سے آپ کی بات کرا سکتا ہوں۔''

''تو کراؤ۔'' آنیہ نے کہا۔

وہ اردگرد دیکھ کر بولا۔ ''لیکن یہاں نہیں، آپ کو فورٹ سے باہر آنا ہوگا۔ آپ پریشان نہ ہوں، آپ میری بہن کی طرح ہیں۔''

کچھ پس و پیش کے بعد آنیہ مان گئی۔ اس نے اپنا سامان ایک قریبی کوٹھری میں لاک کیا اور راجا کے ساتھ فورٹ کے پھاٹک کی طرف بڑھ گئی۔ ہیلمٹ ابھی تک راجا کے سر پر تھا۔ تاہم ونڈ شیلڈ اس نے اٹھا رکھی تھی۔ آنیہ کو محسوس ہوا کہ وہ چوکس نگاہوں سے اردگرد کا جائزہ بھی لے رہا ہے جیسے جاننا چاہ رہا ہو کہ کوئی ان کے پیچھے تو نہیں آ رہا۔ وہ فورٹ سے باہر نکلے۔ یہاں راجا کی بائیک کھڑی تھی اور بائیک کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سوزوکی کار بھی کھڑی تھی۔ کار خالی تھی۔ راجا نے اپنے اسمارٹ فون پر ''واٹس ایپ'' آن کیا اور پھر راسو سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ فون آنیہ کو تھماتے ہوئے بولا۔ ''گاڑی خالی ہے، آپ اس میں بیٹھ کر اطمینان سے بات کرلیں۔''

آنیہ نے اچھی طرح جھانک کر دیکھا۔ کار واقعی خالی تھی۔ وہ فون تھام کر پچھلی نشست پر بیٹھ گئی۔ سینے میں دل بڑی تیزی سے چل رہا تھا۔ یہ وڈیو کال تھی۔ آنیہ نے اپنے سامنے راسو کو دیکھا۔ تصویر والے شیر بچے اسد اللہ کا پوتا۔ وہ کسی بند کمرے میں بیٹھا تھا مگر بیک گراؤنڈ میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ رسمی کلمات کے بعد وہ بولا۔ ''اتنے عرصے بعد آپ کو دیکھ کر اچھا لگا لیکن آپ کی یہاں آمد بالکل غیر متوقع ہے۔ کیا آپ واقعی صرف پینٹنگ کے لیے آئی ہیں؟''

''یہ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''اس کی بھی ایک وجہ ہے، آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔''

''میں پینٹنگ کا کام مکمل کرنے کے لیے ہی آئی ہوں...... لیکن...... آپ سے بھی...... کچھ بات کرنا چاہ رہی تھی۔''

''وہ کیوں محترمہ! آپ تو میرے سائے سے بھی دور بھاگتی رہی ہیں؟''

''مجھے آپ کے بارے میں ماموں دلبر صاحب سے کچھ پتا چلا ہے۔ اردگرد سے بھی کچھ باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ مم...... میں اپنی ناچیز عقل کے مطابق آپ کو کچھ سمجھانا چاہتی ہوں۔''

''زہے نصیب۔'' راسو نے کہا۔ پھر اپنی بڑھی ہوئی شیو کو کھجا کر کہا۔ ''ویسے میرا خیال ہے مس آنیہ خورشید! اب ہم کھل کر بات کر ہی لیں تو اچھا ہے...... آپ...... کل ''چار کوٹھیاں اسٹاپ'' کے آس پاس منڈلا رہی تھیں؟''

''اوہ...... تو میرا یہ اندازہ درست ہے کہ کل مجھے وہاں دیکھا گیا ہے اسی لیے آپ نے مجھ سے رابطہ کیا ہے۔ کیا آپ بھی وہیں موجود ہیں؟''

''نہیں، لیکن راجا اور ایک دو دوست موجود ہیں۔ انہوں نے آپ کو پہچانا اور......''

''پھر میرا پیچھا بھی کیا۔'' آنیہ نے بات مکمل کی۔

''بے شک انہیں تجسس سے مجبور ہو کر کرنا پڑا۔''

آنیہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''راسم صاحب! یہ سب ایک اتفاق کے تحت ہی ہوا ہے۔ میں کل وہاں تھوڑی سی شاپنگ کے لیے گئی تھی۔ میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ راجا یا آپ کا کوئی اور دوست وہاں موجود ہوگا اور مجھے دیکھ لے گا۔''

''مس آنیہ! میں آپ سے بحث کرنا نہیں چاہتا...... لیکن آپ نے وہاں خصوصی طور پر ''چار کوٹھیوں'' کی طرف توجہ دی۔ آپ ان کا جائزہ لیتی رہیں۔ جیسے آپ کو معلوم ہو کہ یہاں کچھ ہے۔''

اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''راسم صاحب! آپ غلط فہمی کا شکار ہو رہے ہیں۔ میں ان کوٹھیوں کی طرف متوجہ ہوئی ہوں گی تو ان کی ساخت اور ایک جیسی بناوٹ کی وجہ سے...... لیکن...... کچھ بھی ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ میرے حق میں بہتر ہی ثابت ہوا ہے۔ آپ سے رابطہ تو ہو گیا ہے۔''

پتا نہیں کہ آنیہ کے جواب نے راسو کو مطمئن کیا یا نہیں مگر اس کا لب ولہجہ بدستور اپنائیت کا رہا۔ اس نے نہار کور اور دلبر ماموں وغیرہ کی خیریت دریافت کی پھر کہنے لگا۔ ''آپ ایک منٹ کے لیے میری بات راجا سے کروا سکتی ہیں؟''

آنیہ نے کار کی کھڑکی کھولی اور کچھ فاصلے پر موجود راجا کو موبائل فون دکھایا۔ وہ موٹر بائیک کے قریب بیٹھا اس سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ ہیلمٹ اب تک اس کے سر پر تھا۔ وہ آنیہ کے پاس آیا اور موبائل فون لے کر راسو سے بات کرنے لگا۔ بات کرتے ہوئے وہ دس پندرہ قدم دور چلا گیا۔ دو منٹ بعد واپس آ کر اس نے موبائل آنیہ کو تھما دیا۔

راسو نے کہا۔ ''اس وقت میں راجوری میں ہی ہوں مگر کل کا پتا نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ صبح یہاں سے جانا پڑے۔ پھر کئی دن تک واپسی نہیں ہوگی۔ اگر آپ ملنا چاہتی ہیں تو پھر آج ہی مل لیں۔''

آنیہ نے چند لمحے تک سوچنے کے بعد کہا۔ ''کہاں مل سکتے ہیں آپ؟''

''آپ کو سب کچھ پتا ہی ہے، میں جہاں ہوں وہاں سے میرا، آپ سے ملنے کے لیے نکلنا ٹھیک نہیں ہے۔ اگر آپ کو بھروسا ہے تو پھر راجا کے ساتھ آجایئے۔ یہ اسی گاڑی پر آپ کو یہاں لے آئے گا۔''

آنیہ نے چند سیکنڈ کے لیے سوچا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ آج راسو سے نہ مل سکی تو پھر شاید...... اس سے ملنا مشکل ہو جائے گا۔ نہ جانے اچانک اس کے دل میں کیا آئی کہ بہت سے اندیشوں کے باوجود اس نے کہہ دیا۔ ''ٹھیک ہے، اگر کوئی خطرہ نہیں ہے تو...... میں آجاتی ہوں۔''

یہ جاننے کے بعد کہ وہی اسد اللہ کا پوتا ہے، وہ اس کے لیے ایک عجیب سی اپنائیت محسوس کرنے لگی تھی۔ اس کیفیت کو خیر، محبت تو نہیں کہا جاسکتا تھا مگر وہ اسے کوئی واضح نام بھی نہیں دے پا رہی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ راجا کے ساتھ سوزوکی کار میں راسو کی طرف جا رہی تھی۔ راجا ڈرائیونگ کر رہا تھا، وہ عقبی نشست پر تھی۔ راجا نے موٹر بائیک وہیں لاک رہنے دی تھی۔ وہ غالباً راجا کے کسی ساتھی کی تھی۔ دورانِ ڈرائیونگ، راجا بار بار عقب نما آئینے میں اور دائیں بائیں بھی دیکھتا تھا۔ جیسے وہ غیر شعوری طور پر اپنے اردگرد سے باخبر رہنا چاہتا ہو۔ وہ ایسے اندرونی راستے استعمال کر رہا تھا جہاں کسی پولیس ناکے یا فوجی چیک پوسٹ کا احتمال کم سے کم ہو۔ قریباً بیس منٹ کے سفر کے بعد وہ کل کی طرح آج پھر ''چار کوٹھیاں اسٹاپ'' کے قریب موجود تھی۔ ایک کوٹھی کا گیٹ کھلا اور سوزوکی اندر داخل ہوگئی۔ اس کا مطلب تھا کہ راسو نے غلط بتایا تھا کہ وہ ''چار کوٹھیاں'' میں نہیں ہے۔ یہ غلط بیانی غالباً اسے احتیاط کے پیشِ نظر کرنا پڑی تھی۔

اس گودام میں فرشی اور دیواروں والی ٹائیلوں کا بہت بڑا اسٹاک تھا۔ چھوٹے بڑے کمرے بھرے ہوئے تھے۔ ایک دو چھوٹے لوڈر بھی کھڑے تھے۔ سوزوکی کوٹھی کے عقبی حصے میں آکر ایک درخت کے نیچے رک گئی۔ آنیہ، راجا کے ساتھ ذرا جھجکتی ہوئی ایک زینے پر آئی اور کوٹھی کی بالائی منزل پر پہنچ گئی۔ یہاں خاموشی تھی۔ کھڑکیاں بند تھیں اور ان کے آگے بھاری پردے کھنچے ہوئے تھے۔ کوٹھی کا یہ حصہ گودام نہیں دکھائی دیتا تھا۔ کہیں پکنے والے کھانے کی مدھم سی خوشبو بھی آرہی تھی۔ ایک کمرے میں پہنچتے ہی راجا کا رویہ ایک دم بدلا ہوا نظر آنے لگا۔ اس نے دروازہ بند کیا اور آنیہ کی طرف گھوم کر سخت لہجے میں بولا۔ ''دیکھو مس آنیہ! آپ اپنے لیے مشکل پیدا کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ آپ کو صاف صاف بتانا پڑے گا کہ آپ کو ''چار کوٹھیوں'' کا پتا کس نے بتایا ہے۔''

آنیہ، راجا کا سرخ چہرہ دیکھ کر حیران رہ گئی اور اسے پہلی بار شک ہوا کہ اس کے لباس کے نیچے کوئی ہتھیار وغیرہ بھی موجود ہے۔ ''میں نے کچھ نہیں چھپایا اور آپ مجھ سے سوال جواب مت کرو۔ آپ مجھے یہاں راسو سے ملانے لائے ہو۔''

''راسو بھی آجائے گا، پہلے میرے سوال کا جواب دو تم۔'' راجا آپ سے تم پر آگیا۔ اس کی آنکھوں میں بھی سرخی چمکنے لگی تھی۔ ''شاپنگ والی اسٹوری مت سناؤ۔ تم صرف اس جگہ کے کھوج میں یہاں پہنچی تھیں اور تم اکیلی بھی نہیں ہو۔ ہمیں ڈاج دینے کی کوشش کر رہی ہو۔''

''مسٹر راجا! آپ تمیز سے بات کرو۔ میں کسی کو دھوکا نہیں دے رہی۔''

''دھوکا اور کسے کہتے ہیں۔'' راجا نے دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھا دی۔

یہی وقت تھا جب کسی اندرونی کمرے سے راسو برآمد ہوا۔ اس کے شانوں تک جاتے ہوئے بال اب کچھ چھوٹے ہوچکے تھے۔ وہ شلوار قمیص میں تھا۔ وہ بپھرے ہوئے راجا اور آنیہ کے درمیان آگیا۔ ''راجا! تم چپ رہو، میں خود بات کرتا ہوں ان سے۔ تم دوسرے کمرے میں جاؤ۔''

راجا نے غصیلے انداز میں کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر پھر ارادہ بدل دیا۔ آنیہ کو کڑی نظروں سے گھورتا ہوا وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ راسو نے آنیہ کو صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی بیٹھ گیا۔ ''ریلیکس مس آنیہ! ہم ایسے حالات سے گزر رہے ہیں کہ اپنے سائے پر بھی شک کرنا پڑتا ہے...... اور کل آپ کا یہاں آنے کا جو انداز تھا، اس نے ہمیں واقعی ٹھٹکایا ہے۔ ضلع بھر کی پولیس میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے اور صرف پولیس ہی نہیں کچھ اور لوگ بھی ہیں، میں کوشش کے باوجود آپ کی اس بات پر یقین نہیں کر پا رہا کہ کل آپ اتفاقاً......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ کر بے قراری سے دائیں بائیں سر ہلایا۔ اس کا ہاتھ بے ساختہ

www.pakistanipoint.com

سگریٹ کے لیے اپنی چیسٹ پاکٹ کی طرف گیا مگر پھر آنیہ کی موجودگی کا احساس کر کے وہ رک گیا۔
''آپ کب پہنچی ہیں یہاں راجوری میں؟'' وہ اس سے سوال جواب کرنے لگا۔
آنیہ اس صورتِ حال کے لیے تیار ہو چکی تھی۔ لہٰذا راسو کے سوالوں کے مناسب جواب دیتی رہی۔ وہ جھوٹ بولنا نہیں چاہتی تھی مگر سچ کیسے بتاتی؟ وہ کیسے بتاتی کہ زباب منزل میں اس کی گرفتاری کی رات وہ اس کے بیڈ روم میں، اور بالآخر اس چور خانے تک پہنچی تھی جہاں اس کا موبائل اور اس کی سیاہ کور والی ڈائری پڑی تھی۔ وہ ڈائری جس میں ایک ناقابلِ فہم زبان میں اس کی زندگی کا سب سے بڑا راز بند تھا، یہ حقیقت چھپی ہوئی تھی کہ وہ آپا خالہ کا بیٹا راسو نہیں، وہ حیدر فیملی کا چشم و چراغ ہے۔ زباب منزل اور اپنے باپ دادا کے شاندار ماضی کا اصل وارث۔ بے شک سیاہ گرد پوش والی وہ ساری ڈائری ہی انکشاف انگیز تھی۔ اسی ڈائری نے آنیہ کو یہ بتایا تھا کہ راسو جو بظاہر راجوری ٹاؤن کا ایک آوارہ گرد ہے، دراصل ایک بہت بڑے ''کاز'' سے وابستہ ہے۔ اس کی عام سی شخصیت کے اندر کشمیر کا ایک فریڈم فائٹر چھپا ہوا ہے۔
راسم کے سوال جواب نے طول پکڑا تو آنیہ کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ وہ بولی۔ ''راسم! یہ بات درست ہے کہ میں ایک بار آپ سے ملنا چاہتی تھی، آپ سے بات کرنا چاہتی تھی مگر میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں کہ اس میں کسی بھی طرح کی بُری نیت کو دخل نہیں ہے، نہ ہی اس سلسلے میں کوئی اور میرے ساتھ ہے۔ آپ اس بارے میں جس طرح کا حلف چاہیں مجھ سے لے سکتے ہیں۔''
راسم، راسو نے بڑے دھیان سے اس کی جانب دیکھا۔ آنیہ کے لب و لہجے میں کوئی ایسی بات تھی جس نے اسے یکدم شک کی بھول بھلیوں سے یقین کی منزل پر لا کھڑا کیا۔ اس نے آنیہ کی آنکھوں میں جھانکا اور گہری سانس لے کر بولا۔ ''اوکے...... آئی ایم سوری، میں اس بارے میں اب آپ سے کچھ نہیں پوچھوں گا...... لیکن مجھے...... راجا کو ذرا مطمئن کرنا ہوگا۔''
آنیہ خاموش رہی۔ اس کی پلکوں پر ایک دو موتی اٹکے ہوئے تھے۔ راسو نے مزید کہا۔ ''یہ گودام راجا کا ہی ہے۔ میرا قریبی دوست ہے۔ غصے کا تھوڑا تیز ہے لیکن دل کا اچھا ہے۔''
آنیہ کو وہیں چھوڑ کر راسو دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد راسو اور راجا کے جھگڑنے کی مدھم آوازیں آنے لگیں۔ الفاظ آنیہ کی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ پہلے تو دونوں ہی بلند آواز میں بولے پھر دھیرے دھیرے راجا کی آواز مدھم ہونے لگی۔ قریباً پانچ منٹ بعد راسو واپس آ گیا۔
''آپ چائے پئیں گی؟'' اس نے نارمل لہجے میں آنیہ سے پوچھا۔
''نہیں، کچھ نہیں۔ بس دو چار سوالات ہیں جو بڑے دنوں سے ذہن میں کلبلا رہے ہیں، وہ آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں۔''
''چلیں سوالات بھی کر لیجیے گا مگر چائے تو ہونی چاہیے۔'' اس نے کہا اور دائیں جانب چلا گیا۔ آنیہ کے اندازے کے مطابق کچن اسی طرف تھا۔ آنیہ کا خیال تھا کہ وہاں کوئی عورت بھی موجود ہے۔ ایک منٹ بعد راسو واپس آ گیا۔ ابھی وہ بیٹھا ہی تھا کہ کسی کمرے سے کسی عورت کے بلند آواز میں کراہنے کی آواز سنائی دی۔ آنیہ چونک گئی راسو پھر باہر چلا گیا۔ اس کی واپسی دو تین منٹ بعد ہوئی۔ اس نے کچھ نہیں بتایا نہ ہی آنیہ نے کچھ پوچھا۔ وہ اب گفتگو کے موڈ میں نظر آ رہا تھا۔ سب سے پہلے اس نے آنیہ سے ڈھائی تین ماہ پہلے کی اس رات کے بارے میں بات کی جب وہ گرفتار ہوا تھا۔ اس نے آنیہ سے پوچھا کہ وہ زباب منزل سے کیسے نکل پائی؟
آنیہ نے اسے مختصراً اس بارے میں بتایا پھر اس سے پوچھا۔ ''راسم! لوگوں کا کہنا ہے کہ نو بیاہتا جوڑے ظہیر اور نادیہ کو آپ نے ہی ٹھیکیدار وغیرہ کے چنگل سے نکالا تھا، کیا یہ درست ہے؟''
''بس اللہ نے مجھے ان کی مدد کا وسیلہ بنا دیا، ورنہ میں اس قابل تو نہیں ہوں۔'' اس نے عام سے لہجے میں کہا۔
''اور آپ کی گرفتاری بھی اسی وجہ سے ہوئی؟''
''فی زمانہ اچھے کام کا کچھ خمیازہ تو بھگتنا ہی پڑتا ہے۔ ویسے بھی مقامی پولیس کو بڑی خوشی ہوتی ہے، مجھے مہمان بنا کر۔ کچھ عرصہ پہلے مجھ پر منشیات کا کیس ڈال دیا تھا اور پھر وہ واقعہ تو آپ کی یہاں موجودگی میں ہی ہوا تھا جب کہیں ڈکیتی ہوئی تھی اور مشتبہ افراد میں شامل ہونے کا اعزاز مجھے بھی بخش دیا گیا تھا۔''
اسی دوران میں دروازے کے باہر آہٹ ہوئی۔ راسو جلدی سے اٹھا اور چائے والی ٹرے پکڑ لی۔ چائے لانے والی کو دیکھ کر آنیہ کو شدید حیرت ہوئی۔ یہ ایک ٹانگ سے معذور سدرہ احمد تھی۔ آج آنیہ پہلی بار اسے اتنے قریب سے دیکھ رہی تھی۔ وہ کافی خوب صورت تھی۔ تاہم گہری سیاہ

www.pakistanipoint.com

آنکھوں میں ایک طرح کا دکھ ہلکورے لیتا تھا۔ ''السلام علیکم۔'' سدرہ نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

آنیہ نے وعلیکم السلام کہا اور اٹھ کر اسے گلے سے لگایا۔ ''آجائیں ناں آپ بھی۔'' آنیہ بولی۔

''نہیں، میں ابھی ذرا کوکنگ کررہی تھی۔'' سدرہ دوستانہ لہجے میں بولی اور اجازت لے کر لنگڑاتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔

آنیہ دوبارہ صوفے پر بیٹھ گئی اور آہ سی بھر کر بولی۔ ''کتنی پیاری ہیں...... لیکن یہ ٹانگ کا نقص...... کیا...... واقعی یہ سیڑھیوں سے ہی گری تھیں؟''

''یہی سمجھ لیں۔'' راسو نے مختصر جواب دیا۔ لگتا تھا کہ وہ اس بارے میں زیادہ بات کرنا نہیں چاہتا۔

یکایک آنیہ کا دھیان نوبیاہتا جوڑے کی طرف چلا گیا۔ وہ بولی۔ ''راسم صاحب! ظہیر اور نادیہ کے بارے میں مجھے بڑا تجسس رہا ہے۔ وہ دونوں خیر خیریت سے تو ہیں ناں؟''

''بالکل خیریت سے ہیں۔''

''لیکن کہاں؟''

''راجوری سے کافی دور...... قریباً 3000 کلومیٹر دور...... بنگلور کے ایک قصبے میں، وہ جگہ ان کے لیے بہت محفوظ ہے۔ کیا آپ انہیں دیکھنا چاہیں گی؟''

''کیسے؟'' آنیہ نے پلکیں جھپک کر پوچھا۔

راسو نے اپنا موبائل اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''پرسوں ظہیر نے مجھے اپنی یہ وڈیو بھیجی ہے۔'' اس نے وڈیو پلے کر کے موبائل آنیہ کی طرف بڑھا دیا۔ گڑیا سی نادیہ ایک چھوٹے سے مگر آراستہ کچن میں آٹا گوندھ رہی تھی۔ بس اس کا عقب نظر آرہا تھا۔ ظہیر دبے پاؤں پیچھے سے آیا اور ایک دم آواز نکال کر اسے ڈرا دیا۔ وہ چلا کر مڑی۔ آٹے والا برتن بھی گر گیا۔ اس نے پیار بھرے غصے سے ظہیر کی طرف دیکھا۔ اس کے کومل ہاتھ آٹے میں لتھڑے ہوئے تھے...... تب اچانک اس نے اپنے لتھڑے ہوئے ہاتھ ظہیر کے چہرے اور گردن پر مل دیے...... اور بھاگ کھڑی ہوئی۔ ظہیر نے کیمرے کا رخ اپنی طرف موڑ کر اپنا آٹے میں سنا ہوا چہرہ دکھایا اور پھر نادیہ کے پیچھے لپکا۔ ''ٹھہر جا بتاتا ہوں تجھے۔'' اس کی آواز ریکارڈ ہوئی۔ پھر کیمرے نے نادیہ کو دکھایا۔ وہ ہنس ہنس کر سرخ ہورہی تھی اور اپنی ساس یعنی ظہیر کی والدہ کے پیچھے جا چھپی تھی۔ یہ ایک منٹ کا وڈیو کلپ ان دونوں کی خیر خیریت کی مکمل تفصیل پیش کررہا تھا۔

آنیہ کو یہ سب اچھا لگا مگر پھر وہ کسی سوچ میں گم ہوگئی۔ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ ''لیکن آپ کو اس کے لیے بھاری قیمت چکانا پڑی۔''

''زیادہ بھاری نہیں۔'' راسو ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔ جسمانی ریمانڈ کے دوران میں ہی مجھے نکل جانے کا موقع مل گیا۔ کورٹ کے احاطے میں ہی دو کانسٹیبلوں کے ساتھ تھوڑی سی دھینگا مشتی کر کے میں نکل بھاگا۔''

''اور اب آپ اشتہاری ہوچکے ہیں۔ پولیس اور فوج آپ کو ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔''

وہ عجیب انداز سے مسکرایا۔ ''پولیس اور فوج، اکیلا مجھ کو ہی تو نہیں ڈھونڈ رہی...... ان کو تو اس خطے کے سارے ہی مسلم نوجوان مطلوب ہیں۔ ایک بہانہ نہ ہوگا تو کوئی دوسرا بہانہ ہوگا۔ بس کرنل اروڑا جیسے لوگ سلامت رہیں پھر یہ سلسلہ چلتا ہی رہنا ہے۔''

ایک دم کوئی نیا خیال اس کے ذہن میں آیا۔ وہ آنیہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''ابھی آپ نے فون پر، نہار کے ماموں دلبر صاحب کا ذکر کیا تھا...... آپ کہہ رہی تھیں کہ انہوں نے آپ کو میرے بارے میں کچھ بتایا ہے۔''

''صرف انہوں نے ہی نہیں بتایا۔ بہت سے لوگوں کا خیال یہی ہے کہ......'' وہ کہتے کہتے چپ ہوگئی۔ کوشش کے باوجود فقرہ مکمل نہیں کرسکی۔

''دیکھیں آنیہ، آپ کو جو کہنا ہے کھل کر کہیں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کی کسی بات کا برا نہیں مانوں گا۔ اس کے علاوہ یہاں آپ جو کچھ بھی کہیں گی وہ بس ہم دونوں کے درمیان رہے گا۔ آپ جانتی ہیں کہ آپ...... میرے لیے خاص اہمیت رکھتی ہیں، میں آپ سے جو بات کہوں گا، وہ لوہے پر لکیر ہوگی۔''

آنیہ کی پلکیں بے ساختہ لرز گئیں۔ وہ کھڑکی کی جانب دیکھنے لگی۔ یہ ''خاص اہمیت'' والی بات اس نے زباب منزل میں بھی کہی تھی۔

''آپ کس سوچ میں کھو گئی ہیں، بات تو مکمل کر دیجیے۔''

وہ بولی۔ ''لوگوں کا کہنا ہے کہ آپ کا تعلق کشمیر کی کسی خفیہ تنظیم سے ہے۔ آپ مسلح جدوجہد میں شریک ہوچکے ہیں...... یا ہونے والے ہیں۔''

''بالفرض ایسا ہے بھی تو اس میں برائی کیا ہے۔ کیا آپ سمجھتی ہیں کہ کشمیر میں ہونے والے ظلم و ستم کو جدوجہد کے بغیر روکا جاسکتا ہے؟ اس وادی کو جابروں کے تسلط سے

www.pakistanipoint.com

آزاد کرایا جاسکتا ہے؟"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن جدوجہد ہتھیار اٹھانے اور خون خرابے کا ہی نام تو نہیں۔ یہ ذرائع ابلاغ کا دور ہے۔ ایک بندے کی آواز چند گھنٹوں کے اندر پوری دنیا میں سنی جاتی ہے تو پھر کیوں نا ہتھیار اٹھانے کے بجائے آواز اٹھائی جائے۔"

"مس آنیہ! آواز تو 72 برس تک اٹھائی جاتی رہی ہے اور اب بھی اٹھائی جارہی ہے لیکن ذرائع ابلاغ کا شور جتنا بڑھ گیا ہے، دنیا اتنی ہی بہری بھی ہوگئی ہے، اب وہ نعروں کی آواز پر نہیں چونکتی، بلکہ شاید گولی کی آواز پر بھی نہیں چونکتی۔ اب وہ دھماکے کی آواز پر چونکتی ہے...... ہمیں نعرے بھی بلند کرنا پڑیں گے اور دنیا کو چونکانا بھی پڑے گا۔"

آنیہ نے حیرت سے راسو کی طرف دیکھا۔ اسے یقین نہیں آیا کہ راسو جیسے بے ڈھنگے لباس اور اُلجھے بالوں والا بے ترتیب شخص ایسی فلسفیانہ بات بھی کرسکتا ہے۔

آنیہ نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔"راسم صاحب! کشمیر کے لوگوں کو ان کی مرضی کے مطابق جینے کا حق ملنا چاہیے۔ اس میں تو دو رائے ہو ہی نہیں سکتیں مگر آپ جانتے ہیں قریباً ایک لاکھ افراد اس جارحانہ راستے پر چل کر اپنی جانیں گنوا چکے ہیں۔ اگر آپ......"

"پلیز مس آنیہ! مجھے دکھ ہورہا ہے کہ آپ اسے جانیں گنوانا کہہ رہی ہیں۔ انہوں نے ایک عظیم مقصد کے لیے جانیں دی ہیں۔ اور جان کس کو پیاری نہیں ہوتی؟ جان اس وقت دی جاتی ہے جب اور کوئی چارہ نہیں رہتا۔" راسو کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔"ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ ایک آواز سن کر چونکی تھیں۔ چونکی تھیں نا؟" اٹھیے...... آیئے، میں آپ کو دکھاتا ہوں وہ آواز کس کی تھی۔"

اس نے عجب جذب کے عالم میں آنیہ کی کلائی تھامی اور اسے اٹھا کر ایک کوریڈور میں لے آیا۔ نیم تاریک کوریڈور کے آخری سرے پر ایک بند دروازہ نظر آیا۔ یہ ایک کمرے کا دروازہ تھا۔ راسو نے دروازہ کھولا اور آنیہ کو اندر لے آیا۔ یہاں دواؤں کی بُو پھیلی ہوئی تھی۔ ایک بیڈ پر ایک زخمی عورت پڑی تھی۔ اسے گلوکوز کی ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ اس کشمیری عورت کی عمر پینتیس چالیس سال ہوگی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ اُکھڑے اُکھڑے سانس لے رہی تھی۔ آنیہ یہ دیکھ کر کانپ گئی کہ اس کے چہرے پر چیچک یا خسرے جیسے بے شمار داغ تھے۔ کئی جگہ یہ داغ گہرے زخموں کی شکل اختیار کرچکے تھے۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر تھی۔

"یہ دیکھو مس آنیہ! پیلٹ گن کا ایک اور شاہکار۔ یہ راجوری میں ہی زخمی ہوئی تھی۔ پچھلے چار ماہ سے اسی طرح بستر پر ہے۔ اس کا شوہر سات سال پہلے سرینگر میں ایک مظاہرے کے دوران میں شہید ہوچکا ہے۔ اس کا ایک بچہ تھا بابر۔ چار ماہ پہلے راجوری میں ایک بڑا مظاہرہ ہوا۔ چودہ پندرہ سالہ بابر بھی اس میں شرکت کے لیے نکل گیا۔ اسے پتا چلا تو یہ دیوانی ماں اسے واپس لانے کے لیے گھر سے نکلی۔ اس نے بچے کو تو بچالیا مگر خود پیلٹ گن کا شکار ہوئی۔ کوئی دو سو چھرّے اس کے جسم میں پیوست ہیں۔ ایک آنکھ بھی ضائع ہوچکی ہے۔ اسے بڑی سرجری کی ضرورت ہے مگر یہ جس وقت کسی بڑے اسپتال میں جائے گی، پکڑی جائے گی۔ اب تو یہ شاید ویسے بھی علاج معالجے کی ضرورتوں سے گزرنے والی ہے۔ اس کے جسم میں زہر پھیل چکا ہے مگر اسپتال جانے کے بجائے یہاں مرنا اسے سہل لگتا ہے۔"

آنیہ سکتہ زدہ کھڑی تھی۔ راسو نے کہا۔"اور یہ کوئی ایک عورت نہیں مس آنیہ! آپ جانتی ہیں ایسے سیکڑوں لوگ اپنی بینائی کھو چکے ہیں۔ شدید زخمی ہوکر سسک رہے ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جو قبرستانوں کی آبادی بڑھا چکے ہیں۔ آپ پنجاب سے آئی ہیں۔ اس آگ کو دور سے دیکھتی رہی ہیں، ہم نے اسے بہت قریب سے دیکھا ہے۔"

آنیہ کو یاد آگیا۔ ڈھائی ماہ پہلے جب وہ یہاں راجوری میں ہی تھی، ایک دن اس نے راسو اور شہابی کو کسی زخمی عورت کے بارے میں بات کرتے سنا تھا۔ راسو بڑے کرب کے عالم میں کہہ رہا تھا۔ اسے اسپتال لے جانے کی ضرورت ہے مگر وہ فوراً پکڑی جائے گی...... اس وقت آنیہ نے سوچا تھا کہ شاید وہ کسی جرائم پیشہ زخمی کے بارے میں بات کررہا ہے۔

راسو کی آنکھوں میں آتشیں آنسو چمک رہے تھے۔ غالباً اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے ہی وہ تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ اسی دوران میں سدرہ لنگڑاتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور گلوکوز کی ڈرپ میں گرتے ہوئے قطروں کا جائزہ لینے لگی۔ (وہ فارمیسی کی طالبہ رہی تھی۔ میڈیکل کی سمجھ بوجھ رکھتی تھی) آنیہ بھی راسو کے پیچھے پیچھے نکل آئی۔ راسو دوبارہ کمرے میں آچکا تھا۔ وہ غمزدہ انداز میں صوفے پر بیٹھا تھا۔ آنیہ نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔"ویری سوری راسم! آپ کو میری بات سے تکلیف ہوئی ہے، مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔"

www.pakistanipoint.com

اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''مس آنیہ! یہاں ہر جگہ دردناک کہانیاں بکھری ہوئی ہیں۔ انسانیت لہولہو ہو رہی ہے۔ ابھی آپ نے ٹانگ سے معذور سدرہ احمد کو دیکھا۔ آپ کے ذہن میں کئی سوال اٹھے ہوں گے۔ مجھے لگتا ہے کہ ایسے ہی کچھ سوال آپ کو یہاں کھینچ لائے ہیں۔ میں درست کہہ رہا ہوں نا؟''

آنیہ نے اثبات میں سر ہلایا پھر ہولے سے بولی۔ ''کہا جاتا ہے کہ یہاں کشمیر میں آپ کا کوئی دوست تھا...... فاروق نام کا...... جو انڈین فورسز کے تشدد کا شکار ہوا۔''

''ہاں، سمجھیں کہ اس سدرہ اور فاروق کی کہانی ایک ہی ہے۔ آپ جاننا چاہتی ہیں تو میں آپ کو بتاؤں گا، بلکہ سب کچھ بتاؤں گا۔ شاید پھر کبھی یہ موقع نہ ملے۔ مجھے...... مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے کہ آپ اس وقت چل کر میرے پاس آئی ہیں۔ میرے ساتھ ہیں اور مجھ سے کچھ جاننا چاہتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ باتیں، ہم دونوں کے درمیان ہی رہیں گی۔''

''انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔'' آنیہ نے جھکی پلکوں کے ساتھ کہا۔ ''اور راسم! ایک بار پھر سوری۔''

''نہیں آنیہ! سوری کی بات نہیں۔ بہت دیر نہیں ہوئی جب میری سوچ بھی وہی تھی جو آپ کی ہے۔ بالکل یہی خیالات...... فاروق میرا سب سے قریبی دوست تھا۔ ہم نے ایف ایس سی بھی اکٹھے ہی کیا تھا۔ وہ اپنی ایک بہن اور بوڑھے ہوتے والدین کے ساتھ رہتا تھا، ان کا واحد سہارا تھا۔ بے شمار دوسرے کشمیری نوجوانوں کی طرح اسے بھی قابض بھارتی فوج سے نفرت تھی۔ وہ مظاہروں میں شریک ہوتا تھا۔ پوسٹر لگاتا تھا اور مسلح فوجیوں پر غلیلوں سے کنکر برساتا تھا۔ یہ مزاحمت کی ایک کمزور سی شکل ہے لیکن میں اسے منع کیا کرتا تھا، خطروں سے آگاہ کرتا تھا مگر ہماری دوستی ایسی تھی کہ کسی بھی کام میں ہم ایک دوسرے کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ مظاہروں میں، میں بھی اس کے ساتھ ہی شامل ہوتا تھا۔ فاروق مردانہ وجاہت میں اپنی مثال آپ تھا۔ کالج کی ایک برہمن لڑکی درشانا اس سے محبت کرنے لگی تھی۔ درشانا خود بھی خوب صورت تھی مگر فاروق سے اس کی روز افزوں محبت اس کی مردانہ وجاہت سے زیادہ اس کے بے مثال اخلاق کی وجہ سے تھی۔ درشانا جانتی تھی کہ ان دونوں کا ایک ہونا مشکل ہے۔ برہمن تو نچلی ذات میں بھی شادی کرنے سے ہچکچاتے ہیں کہاں کہ ایک مسلمان سے پھر بھی وہ اس سے پیار کیے جا رہی تھی۔ درشانا اسی کالج کے ہوسٹل میں رہتی تھی جہاں ہم گریجویشن کر رہے تھے۔ اس دنیا میں ایک نانی اور ماموں کے سوا اس کا اور کوئی نہیں تھا۔ ماموں بھی روزگار کے سلسلے میں ملائیشیا میں تھے۔

ایک دن فوجی ہمارے محلے کے دو نوجوانوں کو پکڑ کر فوجی کیمپ میں لے گئے۔ انہیں مارا پیٹا گیا، تذلیل کی گئی، مرغا بنایا گیا اور کہا گیا کہ وہ محلے کے ان لڑکوں کے نام بتائیں جو فوجی گاڑیوں پر پتھراؤ کرتے ہیں۔ جان بچانے کے لیے ان دونوں نے مجبوراً کچھ نام لکھوا دیے۔ ایک روز میں بازار سے گھر واپس آیا تو مسجد کے قریب واقع خالی پلاٹ میں پریشان کن منظر دیکھا۔ محلے کے قریباً بیس لڑکے اور نوجوان دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے دھوپ میں کھڑے تھے۔ فوجی ان کی پنڈلیوں پر چھڑیاں رسید کر رہے تھے۔ ان میں فاروق بھی شامل تھا پھر ایک باوردی کیپٹن نے لڑکوں کو حکم دیا کہ وہ بلند آواز میں ''پاکستان مردہ باد'' کا نعرہ لگائیں۔ دہشت زدہ لڑکوں نے نعرے لگائے۔ جنہوں نے پس وپیش سے کام لیا انہیں پھر چھڑیاں کھانا پڑیں۔

ایک سپاہی نے فاروق کے سر پر چھڑی سے ضرب لگائی اور گرج کر بولا۔ ''اوئے کنجر! تیرے گلے میں کیا پھنسا ہوا ہے۔ تیری آواز اونچی کیوں نہیں نکل رہی؟''

کیپٹن پہلے ہی تپا ہوا تھا۔ اس نے انگلی سے اشارہ کیا اور سپاہی سے کہا کہ اسے علیحدہ کرو۔ فاروق کو دوسرے لڑکوں سے علیحدہ کر کے ایک اسٹول پر کھڑا کر دیا گیا۔ کیپٹن نے ایک میگا فون فاروق کو تھمایا اور بولا۔ ''اب اس میں بولو اور زور سے بولو لیکن اب نعرہ بدل گیا ہے۔ اب کہو۔ ''میں حرام زادہ ہوں......'' کم از کم دس مرتبہ یہ لفظ بولو۔''

فاروق کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''معاف کر دیں سر! آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ بہت احتیاط کریں گے۔''

''معافی کی باتیں بعد میں ہوں گی۔ فی الحال جو کہہ رہا ہوں، وہ کرو۔'' وہ دہاڑا۔

بیسیوں لوگ کھڑکیوں سے اور دروازوں کی اوٹ سے یہ مناظر دیکھ رہے تھے۔ میں بھی چند افراد کے ساتھ فاصلے پر موجود تھا۔ ان لڑکوں کے لیے کوئی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ فاروق کی آواز جیسے گلے میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ ایک حوالدار نے اس کے بال مٹھی میں جکڑ لیے اور میگا فون اس کے ہونٹوں سے پیوست کر دیا۔ یکایک فاروق نے میگا فون پھینکا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ فوجی اس کے پیچھے لپکے...... گلی کی نکڑ پر انہوں نے اسے دبوچ لیا۔ اسے رائفل کے کندوں اور بوٹوں

www.pakistanipoint.com

کی ٹھوکروں سے بُری طرح پیٹا جانے لگا۔ اس کے کپڑے پھٹ گئے، وہ بے طرح لوٹ پوٹ ہورہا تھا مگر اب اس کا اپنا انداز بھی جارحانہ ہورہا تھا۔ وہ سینے کی پوری قوت سے چلّا رہا تھا...... پاکستان زندہ باد، پاکستان زندہ باد...... مودی قاتل...... مودی حرامی...... مشتعل فوجیوں نے اس کے منہ میں ریت بھردی اور لہولہان کر کے جیپ میں پھینک دیا۔''

راسم عرف راسو خاموش ہوگیا۔ اس کی آنکھوں میں اور چہرے پر کرب تھا۔ غالباً وہی سنگین مناظر اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے تھے۔

''وہ اسے کیمپ میں لے گئے؟'' آنیہ نے پوچھا۔

''پتا نہیں، کہاں لے گئے۔ وہ کسی کو بتاتے تھوڑا ہی ہیں۔ کہا گیا کہ دو چار دن میں چھوٹ جائے گا مگر دو چار دن گزرے، پھر دو چار ہفتے اور پھر مہینے۔ اس کا کچھ پتا نہیں تھا۔ باپ پہلے ہی دل کا مریض تھا، وہ چل بسا۔ ایک بڑا بھائی بال بچے دار تھا۔ وہ فوج کے ڈر سے کہیں غائب ہوگیا۔ بوڑھی ماں بیٹے کی بازیابی کے لیے جوتیاں چٹخاتی رہی اور متعلقہ لوگوں کی منتیں سماجتیں کرتی رہی۔ درشانا بھی ان چند افراد میں شامل تھی جو فاروق کا پتا چلانے کے لیے اپنی سی کوشش کررہے تھے۔ کہا یہی جارہا تھا کہ کیمپ انچارج کرنل آکاش اروڑا ہی اس سلسلے میں کچھ کرسکتا ہے۔ درشانا ایک سفارش کے ذریعے کرنل اروڑا تک پہنچی اور دو تین بار اس کے دفتر جا کر اس سے ملی۔ وہ خوب صورت تھی۔ اروڑا کی نگاہوں کو بھا گئی۔ ایک موقع پر جب وہ اس کے دفتر میں تھی۔ اس نے درشانا سے کوئی نازیبا بات کی جس کا درشانا نے بُرا منایا۔ اروڑا بگڑ گیا اور اسے دھکے دے کر دفتر سے نکال دیا۔ وہ کہتے ہیں ناں کہ مجبور و بے بس میں کوئی انا باقی نہیں رہتی۔ درشانا بھی اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔ وہ پیار نہیں عشق کرتی تھی فاروق سے۔ اس کے لیے ہر حد تک جاسکتی تھی۔ اپنی ہستی تک لُٹا سکتی تھی۔ وہ بے عزت ہونے کے باوجود چند دن بعد پھر کرنل اروڑا سے ملی۔ وہ عورتوں کا شکاری تھا۔ پتا نہیں، اختیار کے نشے میں کتنی عزتیں پامال کرچکا تھا۔ اس کی بیوی نے چھ سات سال پہلے آتما ہتھیا کرلی تھی۔ اس نے درشانا کو باور کرایا کہ اگر وہ اپنے محبوب فاروق کو موت کے منہ سے بچانا اور آزادی دلانا چاہتی ہے تو اس کا ایک ہی راستہ ہے۔ اسے ایک بڑی قربانی دینا ہوگی۔ اس نے درشانا سے کہا۔ ''میں تم سے پریم کرنے لگا ہوں۔ تمہیں اپنا جیون ساتھی بنانا چاہتا ہوں۔ اونچی ذات کا ہندو ہوں۔ دولت اور اثرورسوخ سب کچھ ہے۔ مجھ سے شادی کرلو۔ وہ لڑکا بچ جائے گا۔''

یہ ایک عجیب سودا تھا۔ زندگی اپنے زہر کا تلخ ترین گھونٹ درشانا کو پلا رہی تھی...... اور اس بے چاری نے پی لیا...... اس نے پی لیا۔''

راسم ایک بار پھر خاموش ہوگیا۔ اس کی آنکھوں کے کنارے سرخ ہورہے تھے۔

آنیہ نے پوچھا۔ ''اس نے اروڑا سے شادی کرلی؟''

''ہاں، باقاعدہ شادی کرلی۔ اروڑا نے اسے بتایا کہ فاروق کشمیر کے بجائے ہماچل پردیش کی ایک جیل میں ہے۔ وہ اسے وہاں سے بخیریت رہا کرائے گا اور یہی اس رُوداد کا سب سے المناک پہلو ہے۔ جب اروڑا یہ سب کچھ کہہ رہا تھا اور خوبرو درشانا سے شادی رچا رہا تھا، فاروق کو جاں بحق ہوئے چار پانچ ماہ ہوچکے تھے۔ وہ بھی ان ہزاروں شہیدوں میں شامل ہوچکا تھا جو قابض فوج کے عقوبت خانوں میں سسک سسک کر دم توڑتے ہیں۔ سفاکی کی انتہا ہے ناں آنیہ! آپ ایک ایسے شخص کی رہائی کے لیے تاوان وصول کرتے ہیں جس کو آپ اپنے ہاتھوں سے مار چکے ہوتے ہیں۔ درشانا نے اپنا تن من جس چیز کے حصول کے لیے کرنل اروڑا کے حوالے کردیا وہ چیز تو موجود ہی نہیں تھی۔ سفاکی اور سنگدلی کی اس سے بدتر مثال اور کیا ہوسکتی ہے۔ اروڑا ایک ہوس کار کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ خود سے 22 سال چھوٹی درشانا اب ہر طرح سے اس کی دسترس میں تھی۔ کئی ماہ اسی طرح گزر گئے۔ درشانا بار بار اروڑا کو اس کا وعدہ یاد دلاتی رہی۔ وہ ٹال مٹول سے کام لیتا رہا پھر ایک روز جب وہ نشے میں دھت تھا اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا کہ...... جو مر گیا ہے، اس کی جان کو کیوں روتی رہتی ہو۔

''اس روز درشانا کو یقین ہوگیا کہ اس کی ساری منتیں سماجتیں اور کوششیں بیکار رہیں۔ فاروق تو اس دنیا میں ہے ہی نہیں۔ وہ اب تک بے صلہ ہی ایک بدبودار بوجھ تلے روندی جاتی رہی ہے، زخمی ہوتی رہی ہے۔ وہ بہت روئی۔ اس کو اپنے گردوپیش سے نفرت ہونے لگی۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ ایک روز وہ سب چھوڑ چھاڑ کر اروڑا کے گھر سے بھاگ گئی مگر وہ اتنی آسانی سے اس کا پیچھا چھوڑنے والا نہیں تھا۔ وہ اُسے پھر پکڑ لایا۔ اس بے چاری کا آگے پیچھے کون تھا، جو اس کی مدد کرتا۔''

راسو کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے جذبات کو بمشکل سنبھال رکھا تھا۔ اس نے آنیہ سے اجازت لے کر سگریٹ سلگائی اور دوسرے کمرے میں جا کر چند گہرے کش

لیے پھر سگریٹ بجھا کر واپس آ گیا۔ کھڑکیوں سے باہر شام کے سائے تاریکی میں بدل رہے تھے۔ آنیہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”راسم! مجھے لگ رہا ہے کہ درشانا اور سدرہ ایک ہی لڑکی کے دو نام ہیں؟“

راسو نے اثبات میں سر ہلایا اور اسی کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔ ”جب دوسری دفعہ درشانا نے اروڑا کے چنگل سے نکلنے کی کوشش کی تو اس نے اپنی ایک سنگین دھمکی کو عملی جامہ پہنا دیا۔ اس نے ایک وزنی رائفل کا بٹ مار کر سچ مچ درشانا کی ٹانگ توڑ دی۔ کہا یہی گیا کہ وہ سیڑھیوں سے گر گئی ہے۔ وہ ایک ماہ اسپتال میں زیرِ علاج رہی اور تب پھر اروڑا کے زنداں میں چلی گئی۔ چند دن بعد وہ بیمار ہو گئی۔ وہ ٹائیفائڈ میں مبتلا ہو گئی تھی اور روتی رہتی تھی۔ اروڑا کا دل بھی بتدریج اس سے بھر گیا تھا۔ اس نے سراسر اپنی شرائط پر اسے طلاق دے دی۔ وہ بالکل بے آسرا تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ دنیا کے اس سانپوں سے بھرے جنگل میں بھٹک جاتی، میں اپنے یار فاروق کی نسبت سے اسے زباب منزل میں لے آیا۔ وہ اب تک ایک بہن کی طرح میرے ساتھ رہی ہے۔ یہ کچھ ماہ پہلے کی بات ہے جب درشانا نے اچانک ایک اہم فیصلہ کیا۔ وہ اپنی رضا اور چاہت سے مسلمان ہو گئی۔ اس کا نام سدرہ رکھا گیا۔ میں اپنی اس مسلمان بہن کی ذہنی کیفیت کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ ایک طرح سے خود کو مطلقہ نہیں سمجھتی بلکہ فاروق کی بیوہ سمجھتی ہے...... اور باقی زندگی اسی کے نام پر گزارنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس کی نانی اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ ماموں بے چارہ بیرونِ ملک ہے اور دنیا کے جھمیلوں سے گھبرانے والا شخص ہے۔“

اچانک کوریڈور کی طرف سے چلّانے کی آواز آئی۔ یہ سدرہ ہی کی آواز تھی۔ وہ شاید راسو کو بلا رہی تھی۔ راسو لپک کر آواز کی طرف گیا۔ آنیہ اس کے پیچھے گئی۔

وہ اس کمرے میں پہنچے جہاں درمیانی عمر کی کشمیری عورت زخموں سے چور نازک حالت میں پڑی تھی۔ اس کی سانس ایک دم ہی اکھڑ گئی تھی۔ سینہ بُری طرح ہچکولے کھا رہا تھا۔ سدرہ نے پکارا۔ ”ان کو آکسیجن چاہیے فوراً...... ورنہ کچھ بھی ہو جائے گا۔“

راسو لپک کر ساتھ والے کمرے میں گیا اور وہاں سے آکسیجن کا ایک سلنڈر گھسیٹ کر لے آیا۔ اسٹینڈ وغیرہ بھی موجود تھا۔ لگتا تھا کہ ایمرجنسی میں پہلے بھی خاتون کو آکسیجن لگائی گئی ہے۔ خاتون کا چہرہ اور ہونٹ بالکل نیلے ہو رہے تھے۔ ان کی دھڑکن بحال رکھنے کے لیے راسو دباؤ ڈال کر دل کو پمپ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ آکسیجن کا ماسک ڈھونڈ رہا تھا۔ ماسک مل نہیں رہا تھا۔ وہ خاتون کو ماؤتھ ٹو ماؤتھ ”بریدنگ“ دیتے ہوئے پکارا۔ ”سدرہ ماسک دیکھو۔ میرے کمرے میں کہیں پڑا ہوگا۔ سدرہ بے چاری لنگڑاتی ہوئی قریبی کمرے کی طرف لپکی۔ آنیہ بھی اس کی مدد کے لیے بڑھی۔ ایک منٹ میں انہوں نے پورے کمرے کو الٹ پلٹ دیا۔ سدرہ بولی۔ ”مجھے لگتا ہے ماسک والا ڈبا اس الماری کے اوپر رکھا ہوا تھا۔“

آنیہ جلدی سے ایک اسٹول پر چڑھی اور الماری کے پیچھے جھانکا۔ نیلے رنگ کا ڈبا الماری کے پیچھے خلا میں گرا ہوا تھا۔ اس نے بازو لمبا کر کے ڈبے تک پہنچانے کی کوشش کی۔ اسی دوران میں اسے ایک بڑی گن نظر آئی۔ وہ ایک ہی نگاہ میں پہچان گئی۔ یہ وہی ”M2HB“ تھی جس کا ذکر پروفیسر زیڈ اے صدیقی نے کیا تھا اور تصویر بھی دکھائی تھی۔ آنیہ جلدی سے ماسک اور اس کی نالی والا ڈبا لے کر واپس راسو کے پاس پہنچی۔ راسو نے پلک جھپکتے میں خاتون کو آکسیجن لگا دی۔ بروقت فرسٹ ایڈ ملنے سے ان کے چہرے کی نیلاہٹ کچھ کم ہو گئی تھی۔ کچھ دیر بعد سانس کی ابتری بھی کچھ ماند محسوس ہوئی۔ یوں لگتا تھا کہ چھوٹے چھوٹے اَن گنت زخموں کا زہر ان کے سارے جسم میں پھیل چکا ہے۔ اب تو شاید باقاعدہ سرجری اور پراپر ”ٹریٹ منٹ“ بھی ان کا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ سدرہ گلوکوز کی ڈرپ میں کچھ انجکشن لگانے میں مصروف ہو گئی تھی...... چند منٹ بعد مریضہ کی حالت میں افاقہ محسوس ہوا...... اور پھر وہ سو گئیں۔

کچھ دیر بعد آنیہ اور راسو واپس کمرے میں آ گئے۔

گن دیکھنے کے بعد آنیہ کے جسم میں عجیب سنسنی سی پھیل گئی تھی۔ اس کا یہ یقین پختہ ہو گیا تھا کہ راسو ایک نہایت خطرناک راستے پر قدم رکھ چکا ہے اور اب اس کی وجہ بھی بہت حد تک سمجھ میں آ رہی تھی۔ فاروق کی کہانی کشمیر کے اَن گنت نوجوانوں کی کہانی تھی۔ قابض قوتوں کو ان کا ہلکا پھلکا احتجاج بھی گوارا نہیں تھا۔ جابر حکمران ان کے ہونٹ سی دینا چاہتے تھے۔ ان کو مکمل طور پر کچل دینے کے ارادے رکھتے تھے۔ شاید پروفیسر صدیقی نے ٹھیک ہی کہا تھا، آگ کی اصل تپش کا ادراک اس وقت ہوتا ہے جب انسان اس کی لپیٹ میں ہوتا ہے۔

آنیہ نے کچھ دیر مریضہ کے حوالے سے بات کی پھر سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولی۔ ”کرنل اروڑا تو شاید اب ریٹائرڈ ہو چکا ہے۔“

www.pakistanipoint.com

”آنیہ، ایسے لوگ سروس سے ریٹائر ہو بھی جائیں تب بھی ظلم سے نہیں ہوتے بلکہ کئی تو پہلے سے بھی زیادہ آزاد ہو جاتے ہیں۔ یہ شخص اب کشمیریوں کی زمینوں پر ناجائز قبضے کر رہا ہے۔ ہاؤسنگ سوسائٹیاں بنا رہا ہے۔ راجوری میں تو پہلے سے بن رہی ہیں اب ایک چمبا ٹاؤن میں بھی شروع کر دی ہے۔“ اروڑا کا نام لیتے ہوئے راسو کی بڑی بڑی آنکھوں میں ایک شعلہ سا دہک جاتا تھا۔ شاید یہ شعلہ ہی اسے ایک بڑی آگ کی طرف دھکیل رہا تھا۔

آنیہ نے کہا۔ ”آ کاش اروڑا نے جو کیا، وہ سفاکی اور لاقانونیت کی بدترین مثال ہے اور تو اور اس نے ہوس کاری کے راستے پر چلتے ہوئے اپنی ایک ہم قوم اور ہم مذہب کو بھی نہیں بخشا۔ میرے پاپا ایک بڑے وکیل ہیں راسم! اگر آپ چاہیں تو وہ آپ کی قانونی مدد کر سکتے ہیں۔ اس بدبخت اروڑا کے سلسلے میں بھی اور ظہیر نادیہ والے مسئلے میں بھی۔ بے شک آپ سے بھی ایک غلطی ہوئی ہے پولیس حراست سے بھاگنے والی مگر اسے بھی تو ہینڈل کیا جا سکتا ہے۔“

راسم عجیب انداز میں ہنسا۔ ”آنیہ! میں سمجھتا ہوں کہ آپ مجھے کیا سمجھانا چاہ رہی ہیں لیکن...... میں شاید اس سے کافی آگے نکل چکا ہوں۔ ویسے بھی یہاں کشمیر میں قانون کی جو عملداریاں ہیں، وہ ایک کشمیری ہونے کے ناتے میں آپ سے بہتر سمجھتا ہوں۔“

”لیکن راسم، آپ جیسے باہمت نوجوانوں کی آپ کے کشمیر ہی کو ضرورت ہے۔ آپ اپنی جانوں کو کسی بہتر وقت کے لیے سنبھال رکھیں۔“

”اس سے بہتر وقت کوئی نہیں آئے گا آنیہ! ایک قصاب ہے جو اپنی کند چھری کے ساتھ کشمیر کی شہ رگ پر آن بیٹھا ہے۔ اب بھی سوچتے رہیں گے تو مٹ جائیں گے۔“

”مگر یہ ایک بڑی آگ ہے راسم، تھوڑا تھوڑا پانی آگ کو بجھاتا نہیں ہے، خود ختم ہو جاتا ہے۔“

”مگر وہ دھواں تو پیدا کرتا ہے، جو دور تک جاتا ہے اور ہم یہی دھواں دنیا کو دکھانا چاہتے ہیں۔“

”آپ کسی کو قتل کرنا چاہتے ہیں؟“ آنیہ نے اچانک پوچھا۔ راسم کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔

”یہ آپ کیوں کہہ رہی ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”ویری سوری...... لیکن ابھی جب میں گیس ماسک ڈھونڈ رہی تھی میں نے آپ کی الماری کے پیچھے ایک خطرناک رائفل دیکھی ہے اور اس کی گولیاں بھی۔“

”آپ کی نظر بہت تیز ہے۔“ وہ اسے تعریفی نظروں سے دیکھ کر بولا۔

”مگر اتنی تیز نہیں کہ آپ کے اندر جھانک سکوں۔“

”ہاں اتنی تیز نہیں۔ ویسے آپ میرے اندر نہ ہی جھانکیں تو اچھا ہے۔ آپ بہت ناراض ہو جائیں گی۔“ وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ چہرے پر ہلکی سی شوخی تھی۔

”میں بہت سنجیدہ بات کر رہی تھی راسم، یہ بہت مہنگی رائفل لگتی ہے۔ کہاں سے ملی آپ کو؟“

”نادر چیزیں کہیں نہ کہیں سے تو مل ہی جاتی ہیں۔ آپ کو وہ نایاب تصویر کہاں سے ملی جو آپ نے زباب منزل میں شہابی کو دکھائی تھی؟“ وہ گفتگو کو پھر دوسری طرف لے گیا۔

”وہ جلیانوالا باغ کی تصویر تھی۔ 1919ء میں میرے ایک بزرگ نے اتاری تھی۔ ایک البم میں لگی ہوئی تھی اور پاپا کی ذاتی لائبریری میں موجود تھی۔“

”اب وہ میرے پاس بھی موجود ہے۔“ راسم نے اپنا موبائل فون دکھاتے ہوئے کہا۔ ”شاید شہابی نے اسے اتنا سنبھال کر نہ رکھا ہو، جتنا میں نے رکھا ہوا ہے۔“

”آپ کو اس میں کیا دلچسپی ہے؟ شہابی کے تو یہ دادا ہیں۔“ آنیہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”تو پھر میرے بھی دادا ہی ہوئے نا......“ اس نے بات بنائی۔ ”ویسے میں آپ کو ایک بات بتاؤں۔ شہابی نیوز کا بندہ ہے۔ اسے صرف نئی خبروں اور نئی تصویروں سے دلچسپی ہے۔ یہ پرانی چیزوں اور واقعات سے تعلق رکھنے والی رومانیت اس میں نہیں ہے۔“

”آپ میں ہے؟“ آنیہ نے قدرے بے تکلف لہجے میں پوچھا۔

”بہت زیادہ۔ یادوں کو بہت دیر تک سنبھال کر رکھنے والا بندہ ہوں۔“ اس نے آنیہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ گڑبڑا کر دوسری جانب دیکھنے لگی۔ اس نے پھر موضوع بدلا۔ ”ہاں تو آپ بات کر رہی تھیں جلیانوالا کی تصویر کی۔ میں نے گریجویشن کی ہے۔ آگے ماسٹرز کرتا تو ضرور ہسٹری میں کرتا۔ تحریک آزادی کے سارے واقعات مجھے یاد ہیں۔ خاص طور سے جلیانوالا کے واقعے نے مجھے ہمیشہ متاثر کیا ہے۔ جنرل ڈائر بچپن سے ہی میرے لیے ایک مکروہ کردار تھا۔ جب میں آٹھویں کلاس میں تھا۔ زباب منزل کے سامنے ایک پارسی ڈاکٹر صاحب رہتے تھے۔ انہوں نے سفید رنگ کے دو سٹور پال رکھے تھے۔ ایک بڑا تھا ایک چھوٹا۔ بڑے کا نام میں نے ڈائر رکھ چھوڑا تھا۔ جلیانوالا باغ کے واقعے کی بے شمار تصویریں اور اخباری تراشے

www.pakistanipoint.com

میرے پاس موجود ہیں...... وہ جابر حکمرانوں کے سامنے نہتے لوگوں کی مزاحمت کا ایک یادگار واقعہ تھا۔‘‘

آپ کو اس واقعے میں اس لیے دلچسپی ہے کہ آپ کی رگوں میں اسی شیر بچے کا خون ہے جو اس تصویر میں نظر آتا ہے...... آپ اس کے پوتے ہیں...... یہ بات آنیہ نے زبان سے ادا نہیں کی بلکہ دل ہی دل میں کہی۔ وہ اسے کیسے بتاتی کہ وہ سیاہ ڈائری دیکھ چکی ہے اور اس کی اصلیت سے آگاہ ہو چکی ہے۔ وہ راز جو پچھلے کئی برس سے آپا خالہ اور راسم کے درمیان تھا، اب وہ بھی اس میں شریک ہو چکی تھی۔ وہ آپا خالہ کا نہیں، زباب بیگم کا بیٹا تھا۔

اسی دوران میں راسم نے آنیہ سے دو منٹ کی اجازت لی اور زخمی خاتون کو دیکھنے کے لیے کوریڈور والے کمرے میں چلا گیا۔ مطلع ابر آلود تھا۔ اب ہلکی بارش بھی شروع ہو گئی تھی۔ اس وقت تک آنیہ لازمی گھر پہنچ جاتی تھی۔ اس نے سوچا دلبر ماموں نے پریشان ہونا شروع کر دیا ہوگا۔ اس نے دلبر ماموں کو فون کیا اور بتایا کہ وہ بارش کی وجہ سے اپنی دوست کے گھر رک گئی ہے۔ اب وہ کھانے پر اصرار کر رہی ہے۔ ڈیڑھ دو گھنٹے تک وہ واپس آجائے گی۔ دلبر ماموں کو مطمئن کر کے وہ خود بھی مطمئن ہو گئی۔ سدرہ واقعی اصرار کے ساتھ اسے کھانے کے لیے کہہ رہی تھی، وہ کشمیری پلاؤ بنا رہی تھی...... ہاں سدرہ، جو بھی درشانا تھی۔

راسم واپس آنیہ کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں کاغذ کی ایک پڑیا سی تھی۔ اچانک بولا۔ ’’ایک مرتبہ میں نے آپ کو ایک سیاہ گلاب دینے کی جسارت کی تھی۔ گلابی کناروں والا گلاب۔ پسند آیا تھا آپ کو؟‘‘

آنیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ اسے یہ ذکر بے محل لگا تھا۔ راسم نے کہا۔ ’’اسی لیے آپ نے گلاب ٹیکسی سے باہر پھینک دیا تھا۔ یہ دیکھیں، میں نے اب تک سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔‘‘ اس نے پڑیا کھول کر آنیہ کو دکھائی جس میں گلاب کی خشک پتیاں تھیں۔ وہ لاجواب سی ہو گئی۔ وہ مسکرایا۔ ’’اب تو آپ کو یقین آگیا ہوگا کہ میں یادوں کو سنبھال کر رکھنے والا بندہ ہوں...... زندگی کی آخری سانس تک۔‘‘

’’زندگی کی آخری سانس۔‘‘ اس نے عجیب انداز میں کہا۔ آنیہ چونک کر اسے دیکھنے لگی پھر گہری سنجیدگی سے بولی۔ ’’آپ سے ایک بات پوچھوں؟ سچ سچ بتائیے گا؟‘‘

’’آپ پوچھ رہی ہیں تو پھر سچ ہی بتاؤں گا بلکہ سچ بتانا ہی پڑے گا۔‘‘

’’کہیں آپ کی اس خطرناک رائفل کا ٹارگٹ...... ریٹائرڈ کرنل اروڑا تو نہیں؟‘‘

اس نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ چند گہری سانسیں لیں۔ کھڑکیوں سے باہر بارش کی آواز تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں۔ ایک ہی نگاہ میں اس نے آنیہ کو سر تا پا دیکھا اور جیسے اپنے اندر جذب کر لیا۔ پھر ٹھہری آواز میں بولا۔ ’’پتا نہیں کہ پھر کبھی ایسا موقع آئے گا یا نہیں۔ آپ مجھ سے کچھ پوچھ پائیں گی یا نہیں۔ میں آپ کو کچھ بتا پاؤں گا یا نہیں؟ جی چاہتا ہے آج آپ سے کچھ بھی نہ چھپاؤں۔ وہ بھی نہیں، جو چھپانا چاہیے۔ آپ سامنے ہیں تو ہر مصلحت بالائے طاق رکھنے کو دل چاہتا ہے۔‘‘

’’اس اعتماد کے لیے شکریہ۔ میں اس پر پورا اتروں گی۔‘‘

وہ اسی لہجے میں بولا۔ ’’جس روز میں نے اپنے پیارے فاروق کی ہڈیاں ایک قبرستان میں دفن کی تھیں اور روتی سسکتی سدرہ کے سر پر ہاتھ رکھا تھا اسی روز میں نے یہ قسم کھائی تھی کہ اروڑا کو زندہ نہیں چھوڑوں گا مگر اروڑا تک پہنچنا آسان نہیں ہے۔ وہ سروس کے دوران میں بھی سخت سیکیورٹی میں رہتا تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اس کے گرد سیکیورٹی کا حصار مزید مضبوط ہو چکا ہے۔ گھر، دفتر اور دیگر جگہوں پر درجنوں گارڈز اس کے اردگرد تعینات ہوتے ہیں۔ میں اب تک دو بار اس پر ATTEMPT کر چکا ہوں۔‘‘

یہاں تک کہہ کے راسم خاموش ہو گیا۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور باہر جھانکا۔ غالباً وہ اپنے دوست راجا کی طرف سے تسلی کرنا چاہتا تھا۔ دروازے اور کھڑکی کو اچھی طرح بند کر کے وہ پھر آنیہ کے قریب آبیٹھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ’’پہلی مرتبہ ایک کشمیری مجاہد میرے ساتھ تھا۔ ہم نے ایک ہوٹل کی تقریب میں گھسنے کی کوشش کی۔ وہاں اروڑا موجود تھا۔ گارڈز چوکنے ہو گئے۔ ہمارے اور گارڈز کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہوا۔ گولی لگنے سے میرا ساتھی شہید ہوا اور میرے کندھے پر بھی زخم آیا۔‘‘ راسم نے اپنا کندھا ننگا کر کے زخم دکھایا تو اس کا گھنے بالوں سے بھرا ہوا سینہ کسی شیر کا سینہ نظر آیا۔

’’دوسری کوشش بھی بڑی زبردست تھی مگر خدا کو منظور نہیں تھا، وہ کامیاب نہیں ہوئی۔ موت جیسے اس باسٹرڈ کو چھو کر گزر گئی۔ مجھے کہیں سے تین ہینڈ گرینیڈ ملے تھے۔ امریکن ساخت کے یہ ’’ایم کے ٹو‘‘ نامی ہینڈ گرینیڈ پرانے تھے مگر درست حالت میں لگتے تھے۔ ان میں سے ایک گرینیڈ کو میں نے راجا کے ساتھ جنگل میں جا کر ٹیسٹ کیا اور باقی دونوں

www.pakistanipoint.com

سنبھال لیے۔ ہم دونوں موقع کی تلاش میں رہے۔ یہ موقع ہمیں انڈیا کے پچھلے یوم جمہوریہ پر ملا۔ آکاش اروڑا کی ہاؤسنگ اسکیم میں رات کے وقت آتش بازی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ وہ خود بھی وہاں آرہا تھا۔ میں کسی نہ کسی طرح اس کے نزدیک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ میں مزید قریب جانا چاہتا تھا مگر سیکیورٹی کے حصار کی وجہ سے یہ ممکن نہیں تھا۔ گارڈینیا کی ایک باڑ کے عقب سے میں نے دونوں گرینیڈ اس پر اچھال دیے تھے۔ دونوں گرینیڈ پھٹے لیکن وہ بال بال بچ گیا۔ اس کا ایک گارڈ ہلاک اور دو شدید زخمی ہوئے۔ اس کی اپنی ٹانگ پر بھی زخم آیا مگر وہ شدید نقصان سے محفوظ رہا۔ اسے میری خوش قسمتی ہی کہنا چاہیے کہ گرینیڈ دھماکوں کی وجہ سے موقع پر بجلی کا نظام درہم برہم ہوگیا اور میں وہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوا۔''

راسم نے ذرا توقف کر کے آنیہ کے تاثرات دیکھے جو ہمہ تن متوجہ تھی، وہ بولا۔ ''اس واقعے کے بعد اروڑا کی سیکیورٹی مزید سخت ہوگئی اور اس سختی میں روز بروز اضافہ ہی ہوا ہے۔ جب تک یہ شخص اس زمین پر دندنا رہا ہے، میرے سینے میں ایک نیلی آگ روشن ہے اور یہ مجھے کسی پل چین نہیں لینے دیتی۔ یہ جو گن ابھی آپ نے الماری کے عقب میں دیکھی ہے، میں کئی ماہ سے اس کے پیچھے تھا۔ یہ دور تک مار کرنے والی بہترین آٹومیٹک گنز میں شمار ہوتی ہے۔ اس کو ایم ٹو براؤننگ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ قریباً پونے دو کلومیٹر تک بہ آسانی مار کرسکتی ہے اور اس کی یہی خوبی ہے جو میرے لیے سب سے اہم ہے۔''

''وہ کیوں؟'' آنیہ نے سنسنی خیز لہجے میں پوچھا۔

''اب تک میں نے اس مکروہ اروڑا کے سلسلے میں جتنا بھی ہوم ورک کیا ہے، اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ میں اسے راستے میں تو مارنے کی کامیاب کوشش کرسکتا ہوں مگر اس کے کسی ٹھکانے پر نہیں۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے ہینڈ گرینیڈز والے واقعے کے بعد اس کی سیکیورٹی بہت بڑھ چکی ہے۔''

''راستے سے آپ کی کیا مراد ہے؟'' آنیہ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

وہ مسکرایا۔ ''کہا..... ہے نا کہ آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گا وہ بھی نہیں جس کو جاننے کی آپ کو ضرورت نہیں۔''

وہ ایک مقفل دراز کے اندر سے ایک سفید کاغذ لے آیا۔ اس پر ہاتھ کی مدد سے ہی ایک نقشہ سا بنایا گیا تھا۔ یہ نقشہ اپنے سامنے رکھتے ہوئے راسم نے آنیہ کو بتایا کہ ہفتے میں تین روز آکاش اروڑا اپنی رہائش گاہ سے اپنی ہاؤسنگ اسکیم کی طرف جاتا ہے اور یہ راستہ اختیار کرتا ہے۔ ہائی وے جیسی یہ سڑک ایک جگہ خم کھاتی تھی اور وہاں اونچے نیچے ٹیلے تھے۔ ایسا ہی ایک ٹیلا راسم کے لیے ''کمین گاہ'' کا کام دینے والا تھا۔ اس نے سب کچھ ''کیلکولیٹ'' کیا ہوا تھا۔ جہاں راسم کو گھات لگانا تھی وہ ایسی جگہ تھی جہاں اروڑا کی گاڑی اور اس کے آگے پیچھے چلنے والی گاڑیوں کو کم از کم 30 سیکنڈ تک اس کی زد میں رہنا تھا۔ اس نے اعتراف کیا کہ وہ بہت اچھا نشانے باز نہیں ہے ورنہ شاید وہ اس گن کے بجائے کوئی اسنائپر وغیرہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ بیلٹ کے ذریعے فائر کرنے والی یہ گن ایک سیکنڈ میں کم و بیش 8 گولیاں نکال سکتی تھی۔ بے شک فاصلہ زیادہ تھا مگر راسم کو یقین تھا کہ اس گن کے تین چار برسٹ اروڑا کو اس کے انجام تک پہنچا دیں گے۔

آنیہ نے ہراساں ہو کر کہا۔ ''راسم! یہ بے حد خطرناک کام ہے۔ یہ آپ..... کس راستے پر چل نکلے ہیں؟''

''جب سب راستے بند ہو جاتے ہیں..... تو پھر ایسے ہی راستے نکلا کرتے ہیں۔ یہاں جنگل کا قانون نافذ ہے آنیہ.....'' کچھ کہتے کہتے وہ ایک دم رک گیا پھر مسکرایا اور ذرا ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔ ''آپ نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ یہ گن میں نے حاصل کیسے کی؟'' آنیہ بس اس کی طرف دیکھ کر اور پلکیں جھپکا کر رہ گئی۔ اس نے کہا۔ ''اس طرح کی گنز امریکیوں نے افغان جنگ میں استعمال کی تھیں۔ وہاں لڑنے والا ایک شخص اسے پرزوں کی شکل میں اپنے ساتھ کشمیر لے آیا۔ یہ کافی عرصہ زمین میں دبی رہی ہے لیکن بالکل ٹھیک حالت میں ہے۔ اس شخص کا بیٹا اس گن کے لیے ایک لاکھ روپیا مانگ رہا تھا۔ اس سے کچھ رعایت کروائی ہے۔ اسے خریدنے کے لیے میں نے اپنی ذاتی اشیا اور موٹر سائیکل تک بیچی ہے۔ کچھ دوستوں سے قرض لیا ہے تب یہ اپنی ہو سکی ہے۔'' راسم کی آنکھوں میں جیسے اُمید کے دیے سے جگمگانے لگے تھے۔ آنیہ کو یہ سارا ماحول راسم کی ڈائری سے معلوم ہو چکا تھا۔ اس ڈائری میں راسم نے اس ہتھیار کو اپنے من پسند کھلونے کا نام دیا تھا۔

بارش اب رم جھم کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ وال کلاک ساڑھے آٹھ بجے کا وقت بتا رہا تھا۔ کچن کی طرف خوبرو سدرہ کی زخمی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ راسم نے عجیب جذباتی لہجے میں کہا۔ ''پرسوں پندرہ تاریخ ہے آنیہ، پرسوں میرے پیارے فاروقی کی سالگرہ ہے۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا، میں اپنی شادی اپنی سالگرہ کے دن کر کے ایک انوکھا ریکارڈ

www.pakistanipoint.com

قائم کروں گا۔ جوانی کے کئی خوش رنگ و معصوم منصوبوں کی طرح اس کا یہ منصوبہ بھی قبر کی مٹی میں مل گیا مگر سالگرہ تو موجود ہے۔ میں اپنے یار کو اس سالگرہ پر ایک یادگار تحفہ پیش کروں گا۔ اس شخص کی لاش کا تحفہ جس نے اسے کسی فوجی عقوبت خانے میں سسک سسک کر جان دینے پر مجبور کیا اور کیا پتا، ایسا موقع بھی آیا ہو جب فاروق نے ظلم کرنے والوں سے خود موت کی بھیک مانگی ہو۔ ان سے کہا ہو کہ وہ اسے اذیت نہ دیں، جان سے مار دیں۔ کیا اس طرح موت کی تمنا کرنا کوئی آسان ہوتا ہے مس آنیہ؟...... کیا گاڑیوں کو پتھر مارنے کی سزا اتنی کڑی ہوتی ہے؟ کیا ایک نعرے سے رُوگردانی کا خمیازہ ایسے بھی بھگتنا پڑتا ہے؟...... وہ بھری جوانی میں چلا گیا۔ اس کا باپ مر گیا۔ اس کا بھائی جلاوطن ہو گیا، اس کی ماں نیم دیوانی پھرتی ہے...... اور اس کی مدد کرنے والی کمزور لڑکی کے ساتھ جو کچھ ہوا جس طرح اس کی قربانی کو مٹی میں ملایا گیا، وہ بھی آپ کے سامنے ہے......"

راسم کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں آتشیں آنسو ہلکورے لینے لگے۔

دونوں کتنی ہی دیر گم صم بیٹھے رہے۔ آنیہ جب یہاں راسم کے پاس پہنچی تھی اس کے خیالات اور تھے مگر اب خیالات اور احساسات بالکل مختلف ہو چکے تھے۔ وقت کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے میں کتنا بڑا انقلاب آیا تھا اس کے اندر۔ پتا نہیں اسے کیوں لگ رہا تھا کہ یہ ظلم کی اور مزاحمت کی ایک ہی کہانی ہے جو ہر دور میں دہرائی جاتی رہی ہے۔ تحریکِ پاکستان سے لے کر اور جلیانوالا سے لے کر آزادیٔ کشمیر تک بھی یہ کسی ایک ہی سلسلے کی کڑیاں لگتی تھیں۔ اس نے ایک نظر پھر راسم پر ڈالی جو سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں کہا...... ہاں، تم وہی ہو جس کو میں ڈھونڈنے نکلی تھی۔ اس نے عجیب کھوئے کھوئے سے آہنگ میں کہا۔ "راسم! میں سمجھ گئی ہوں کہ پرسوں آپ کو ہر صورت اپنے منصوبے پر عمل کرنا ہے۔ یہی کہہ سکتی ہوں کہ اگر یہ سب ہونا ہی ہے تو اللہ آپ کو کامیاب کرے لیکن اس کے بعد......"

"اس کے بعد میں، اگر بچ گیا، تو کچھ عرصے کے لیے روپوش ہو جاؤں گا۔ یہ بات میں بھی اچھی طرح جانتا ہوں آنیہ کہ بہادری اور خودکشی میں فرق ہے۔ کٹر ہندو حکمران کے آنے کے بعد حالات جس رخ پر جا رہے ہیں، اندازہ ہوتا ہے کہ بہت جلد فیصلہ کن مرحلہ آنے والا ہے۔ میں اس فیصلہ کن مرحلے کا انتظار کروں گا۔"

"کھانا تیار ہے بھائی۔" کچن کی طرف سے سدرہ کی آواز آئی۔

"آتا ہوں۔" راسم نے کہا پھر آنیہ کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ "جن لوگوں کی آپ کی زندگی میں اہمیت ہوتی ہے، ان کی دعائیں آپ کے لیے بہت کارگر ہوتی ہیں، آپ بھی میرے لیے دعا کرنا۔"

آنیہ کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ اُسے یوں لگا جیسے وہ راسم کو کسی میدان کارزار میں جانے کے لیے الوداع کہہ رہی ہے۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا پھر جیسے اچانک اسے کچھ یاد آیا۔ ہلکی سی مسکان کے ساتھ بولا۔ "راجا ہمارے ساتھ ہی کھانا کھائے گا جو باتیں میں نے آپ کے ساتھ کی ہیں، اس کی بھنک بھی اسے پڑ گئی تو مجھے کچا چبا جائے گا۔"

"ایسا کچھ نہیں ہوگا۔" آنیہ نے افسردہ لہجے میں کہا۔

راسم کھانا لینے کے لیے کچن کی طرف چلا گیا۔ بارش اب رک گئی تھی۔

☆☆☆

دلبر ماموں سے سلام دعا کرنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس کے دل و دماغ میں تہلکہ مچا ہوا تھا۔ اس پر انکشاف ہوا تھا کہ وہ جس راسم سے مل کر آ رہی ہے، وہ اس کو برسوں سے جانتی ہے۔ وہ اسی کے لیے تو جالندھر سے چل کر یہاں راجوری پہنچی تھی۔ وہ برسوں سے اس کے دل و دماغ میں بسا ہوا تھا۔ اس کی دھڑکنوں میں رہتا تھا۔ وہ یہی تھا...... وہ یہی تھا۔ وہ پہلی بار جلیانوالا میں نظر آیا مگر وہ اس سے پہلے بھی موجود تھا۔ 1857ء کی جنگ آزادی میں...... سرنگاپٹم میں، میسور میں، جلیانوالا میں، اور پھر غازی علم دین کے جذبۂ حمیت میں، اور عزیز بھٹی کے عزم میں...... اور شیر خاں کی للکار میں، وہ بہت سی جگہوں پر موجود تھا۔ وہ اس کی روح سے عشق کرتی تھی اور اب وہ سراپا اس کے سامنے تھا۔ جلیانوالا کے "شیر بچے" اسد اللہ کا پوتا۔

یکایک اس کی پیشانی پر پسینا آ گیا۔ اس نے سوچا اگر ابھی نہار کور کا فون آ جائے اور وہ اس سے پوچھے۔ "وہاں کیوں بیٹھی ہوئی ہو؟ کہیں راسو سے محبت تو نہیں کرنے لگی ہو؟" تو وہ کیا جواب دے گی؟ پھر اس کے شفاف گلابی رخساروں پر آنسو پھسلنے لگے۔ راسم کی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔ "آنیہ! آپ میرے لیے دعا کرنا۔"

بے شک اسے دعاؤں کی ضرورت تھی۔ وہ ایسی جگہ پر کھڑا تھا جہاں سے فرشتۂ اجل کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ صاف سنائی دیتی تھی۔ اس نے وضو کیا اور نماز کے لیے کھڑی

www.pakistanipoint.com

ہوگئی۔ رات کے خنک سناٹے میں یہ نماز اور یہ دعا اس کے لیے یادگار تھی۔ وہ اس کی کامیابی اور زندگی مانگ رہی تھی۔ وہی جو دیکھتے ہی دیکھتے اس کے لیے اہم ترین ہوگیا تھا۔

وہ جائے نماز سے اٹھی ہی تھی کہ اس کے موبائل کی بیل ہونے لگی۔ اس نے جلدی سے کال ریسیو کی۔ دوسری جانب سے شہابی حیدر کی ''ہیلو'' سن کر اس کے جسم وجاں میں بیزاری کی سرد لہر دوڑ گئی۔ اس نے کال منقطع کردی۔ وہ اس کا نمبر بہت عرصے سے بلاک کر چکی تھی۔ آج اس نے کسی دوسرے نمبر سے رابطہ کیا تھا۔

رات گزری اور پھر صبح ہوگئی۔ آنیہ ایک ایک پل گن کر گزار رہی تھی۔ وہ جانتی تھی راسم کی زندگی کے اہم ترین لمحات قریب آرہے ہیں۔ اگلے چوبیس گھنٹوں میں ایک بار پھر دن کا اجالا اندھیرے میں اور اندھیرا، اجالے میں بدلا۔ آج پندرہ تاریخ تھی۔ آج کشمیر کے ایک اور گمنام شہید فاروق کی سالگرہ کا دن تھا اور آج ایک اہم واقعے کا دن بھی تھا۔ راسم نے اسے بتایا تھا کہ آکاش اروڑا پر حملہ شام سے تھوڑی دیر پہلے ہوگا، جب وہ اپنی ہاؤسنگ سوسائٹی سے واپس آرہا ہوگا اور شام ہونے والی تھی۔ آنیہ کے ہونٹوں پر خاموش دعائیں تھیں اور دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ کبھی بھی جارحانہ طرزِ عمل اور خونریزی کی قائل نہیں رہی تھی مگر جو کچھ وہ اروڑا کے بارے میں سن چکی تھی اور جان چکی تھی، اس کے بعد اس کے دل سے بھی یہی دعا نکل رہی تھی کہ وہ اپنے انجام کو پہنچ جائے۔

وہ آنکھیں بند کیے لیٹی تھی جب دلبر ماموں کی آواز نے اسے چونکایا۔ ''آنیہ پتر، اِدھر آؤ...... یہ دیکھو...... یہ ٹی وی پر کیا سماچار آرہی ہے؟''

آنیہ کو کچھ پتا نہیں چلا، وہ کب اٹھی......اور کب ٹی وی لاؤنج میں پہنچی۔ اس کا دل کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔

''یہ دیکھو، یہ وہی راسو ہے ناں۔ شہابی کا دوست۔'' دلبر ماموں نے جیسے چلّا کر کہا۔

آنیہ نے اسکرین کی طرف دیکھا اور سکتہ زدہ رہ گئی۔ اسکرین پر ہیڈ لائن کے الفاظ تھے۔ ''سابق کرنل اروڑا قاتلانہ حملے میں بال بال بچ گئے۔ حملہ آور راسم عرف راسو اسلحے سمیت گرفتار۔'' پھر راسم کی ایک فائل فوٹو بھی اسکرین پر ابھری۔ تب ایک بار پھر نیوز کاسٹر ہیجانی انداز میں بولنے لگا۔ ''ہم یہ تازہ ترین سماچار آپ تک پہنچا رہے ہیں۔ ریٹائرڈ کرنل اروڑا جو ''درشن ہاؤسنگ سوسائٹی'' کے مالک بھی ہیں ابھی تھوڑی دیر پہلے سائٹ سے واپس شہر کی طرف آرہے تھے۔ ان پر گھات لگا کر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔ بی ایس ایف کی بروقت کارروائی سے یہ منصوبہ ناکام ہوا ہے۔ ملزم راسو کو فاصلے تک مار کرنے والی گن "M2HB" اور گولیوں سمیت پکڑلیا گیا ہے۔ ملزم نے فرار ہونے کی کوشش کی اور اس کوشش میں زخمی بھی ہوا۔''

پھر فیلڈ رپورٹر اسکرین پر ابھرا۔ وہ مائیک سمیت جائے وقوعہ پر موجود تھا۔ یہ وہ ٹیلے تھے جہاں سے راسم کو فائرنگ کرنا تھی۔ فیلڈ رپورٹر نے کہا۔ ''جی ہاں، یہ ہے وہ جگہ جہاں سے، طویل رینج کی گن کے ذریعے اروڑا صاحب کے قافلے کو نشانہ بنایا جانا تھا۔ یاد رہے کہ راسم عرف راسو وہی شخص ہے جو کچھ عرصہ پہلے راجوری پولیس کی حراست سے فرار ہوا تھا۔ اس پر الزام تھا کہ......''

رپورٹر مسلسل واویلا کر رہا تھا۔ آنیہ کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ اردگرد کی ہر شے گردش میں محسوس ہوتی تھی۔ دلبر ماموں کی آواز جیسے کہیں دور سے اس کے کانوں تک پہنچی۔ ''بھئی منڈا تو یہ ایویں سا لگدا تھا۔ پر کوشش جی داروں والی کی ہے اس نے۔ اگر یہ اپنے ارادے میں سپل ہوجاتا تو چنگا بھلا تہلکہ مچا دینا تھا اِس نے۔ یہ جو گن ٹی وی پر دکھا رہے ہیں ناں، یہ بڑی ہیوی ہے جب میں فوج وچ تھا......'' وہ بولتے رہے۔ آنیہ ڈگمگاتی ہوئی اپنے کمرے میں آگئی۔

☆☆☆

اگلے چار پانچ دن آنیہ کا ہے لگا ہے کرب کی انتہا کو چھوتی رہی۔ وہ ایک بار پھر راجوری سے واپس جالندھر اپنے گھر آچکی تھی۔ بہانہ اس نے یہی بنایا تھا کہ باقی کشمیر کی طرح راجوری میں بھی حالات ٹھیک نہیں۔ پکڑ دھکڑ ہورہی ہے۔ کرفیو لگنے کا بھی اندیشہ ہے وغیرہ وغیرہ۔ کسی وقت وہ ہمت کر کے ٹی وی یا اخبار بھی دیکھ لیتی۔ راسم کو اروڑا کا قافلہ گزرنے سے چار پانچ منٹ پہلے ہی پکڑلیا گیا تھا۔ یقیناً اس کے ساتھ سخت مار پیٹ بھی ہوئی تھی۔ اخبار میں اس کی ایک تصویر دیکھ کر آنیہ کا دل بے تحاشا رویا تھا۔ تصویر میں اس کا بالائی لباس پھٹا ہوا تھا۔ چہرہ دھول سے اٹا ہوا اور ناک منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ اسے اوندھا کر کے اس کے ہاتھ پشت پر باندھے گئے تھے۔ قریب ہی مسلح فوجیوں کے سیاہ بوٹ دکھائی دے رہے تھے۔ آنیہ نے نہار کے سوا ابھی تک کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ اپنے پاپا کو بھی نہیں۔ پاپا کو بھی ابھی تک اس رُوداد کے اہم ترین موڑ کے بارے میں پتا نہیں چلا تھا۔ انہیں ابھی معلوم نہیں تھا کہ البم کی تاریخی فوٹوگراف کا تعلق

www.pakistanipoint.com

شہابی سے نہیں بلکہ راسم سے ہے۔

یہ چوتھے پانچویں روز کی بات ہے آنیہ کے پاپا بڑے غصے کی حالت میں گھر میں داخل ہوئے۔ وہ آتے ساتھ ہی آنیہ کو بیسمنٹ میں لے آئے۔ ”آنو! یہ میں کیا سن رہا ہوں۔“ وہ لرزاں آواز میں بولے۔

”کیا ہوا پاپا؟“ اس نے سہم کر پوچھا۔

”کیا ابھی کچھ ہونا باقی ہے...... میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری دی ہوئی آزادی کا نتیجہ ایسا نکلے گا۔ یہ کون ہے راسم؟ تمہارا کیا تعلق ہے اس سے؟“

آنیہ کا رنگ اُڑ گیا۔ وہ کوشش کے باوجود بول نہیں سکی۔ پاپا نے ایک اخبار اس کے سامنے پھینکا۔ اس میں راسم کے حوالے سے خبر تھی اور ہتھکڑی لگی تصویر بھی موجود تھی۔

”راجوری میں اس سے ملتی رہی ہو تم؟ اس کے پاس آنا جانا رہا ہے تمہارا؟“

”پاپا! م...... میں آپ کو سب بتانا چاہتی تھی۔ شاید آج ہی بتاتی، دراصل......“

اس کے پاپا نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ اگلے دس پندرہ منٹ میں آنیہ اور پاپا کے درمیان جو گفتگو ہوئی، وہ بہت گمبھیر تھی۔ اس گفتگو سے آنیہ پر یہ تکلیف دہ انکشاف ہوا کہ اس ساری مصیبت کے پیچھے کسی اور کا نہیں شہابی کا ہاتھ ہے۔ اسی نے یہ ٹوہ لگائی کہ وہ راجوری میں دو بار ”چار کوٹھیاں اسٹاپ“ پر پہنچی ہے اور راسم سے ملی ہے۔ کم ظرف تھا وہ۔ اُس نے رقابت کمائی تھی اور اپنی فرسٹریشن نکالنے کے لیے آنیہ کو ڈنک مارا تھا۔ یہ جاننے کے بعد کہ راسم تو اریسٹ ہو ہی چکا ہے اس نے آنیہ کے پاپا اور فرحان وغیرہ کو راسم سے اس کے میل جول کے بارے میں بتا دیا تھا۔ آنیہ نے اپنی اس غلطی کا اعتراف کیا اور پاپا کو یہ بھی بتایا کہ راسم سے خدانخواستہ اس کا کوئی ایسا تعلق نہیں تھا جس پر انگلی اٹھائی جاسکے۔ پھر اس نے پاپا کو مکمل رازداری کی شرط پر اس بھید سے بھی آگاہ کر دیا جو سیاہ ڈائری کے ذریعے اس پر اور نہار پر کھلا تھا۔ اس نے انہیں بتایا کہ جلیانوالا باغ کی تصویر کا اصل تعلق راسم سے ہے، شہابی حیدر سے نہیں۔ اسے اپنے پاپا پر پورا بھروسا تھا اور اسے یقین تھا کہ جب اس نے کہہ دیا ہے تو پاپا اس راز کو کبھی اپنے سینے سے باہر نہیں نکالیں گے۔

اس کے پاپا کو بھی صورتِ حال کی اس نئی کروٹ نے ایک شاک پہنچایا لیکن ان کا غم و غصہ ان پر اتنا غالب تھا کہ وہ اس رُوداد کی بوالعجبی پر زیادہ غور نہیں کر سکے۔ انہیں شدید دکھ تھا کہ آنیہ کا میل جول اور اس کا جھکاؤ ایک ایسے شخص کی نسبت سے سامنے آیا ہے جو ایک آوارہ گرد کے طور پر پہچانا جا رہا ہے اور سنگین ترین کیسز میں ملوث ہے۔ بے شک ہر گھریلو معاملے میں ان کی حمایت آنیہ کے ساتھ ہوتی تھی مگر یہ صورتِ حال ان کے لیے کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں تھی۔

دو چار روز کے اندر ہی گھر میں اس طرح کی باتیں گردش کرنے لگیں کہ آنیہ اپنی باقی کی اسٹڈی اگر مکمل کرنا چاہتی ہے تو شادی کے بعد کر لے گی۔ ایک دن ماما نے دوٹوک الفاظ میں آنیہ سے کہا۔ ”آنو! فرحان بہت ڈسٹرب ہے جس طرح کی بات نکلی ہے، وہ تو شاید رشتے سے ہی انکار کر دیتا مگر وہ نیچر کا بُرا نہیں ہے۔ سمجھتا ہے کہ بات کا بتنگڑ بنایا گیا ہے۔ تمہاری خالہ نے بھی کوشش کی ہے کہ معاملہ بگڑنے نہ پائے۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اس معاملے کو اب زیادہ لٹکایا نہ جائے۔“

”کیا مطلب؟“ آنیہ نے خشک لہجے میں کہا۔

”دیکھو تمہاری خالہ مریم بیمار رہتی ہیں۔ وہ جلد سے جلد تمہیں اپنے گھر میں دیکھنا چاہتی ہیں۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ......“

”......کہ میری ساری بے راہ رویوں کو معاف کرنے والے فرحان کو میرا دولھا بنا کر مجھے اس کے حوالے کر دیا جائے۔ یہی کہنا چاہتی ہیں نا آپ؟“ آنیہ کی آواز طنز کے سبب زہرناک ہو رہی تھی۔

”آنو! تو کیسی باتیں کرتی ہے؟ وہ سارا گھرانا تجھ سے پیار کرتا ہے اور سب سے بڑھ کر وہ فرحان......“

”ہاں، ہاں...... کل رات جب وہ کھانے پر آیا تھا، میں دیکھ رہی تھی اُس کا پیار۔ مجھے وہ یوں فاتحانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے میں اس کا سر کیا ہوا قلعہ ہوں اور اب یہ قلعہ اپنے مکینوں سمیت اس کے رحم و کرم پر ہے۔ مجھے ایسا پیار نہیں چاہیے ماما۔ پلیز مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ ابھی کوئی اس گھر میں میری شادی کی بات نہ ہی کرے تو اچھا ہے......“

وہ اٹھی اور پاؤں پٹختی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ اس گھر میں اسے ہمیشہ اپنے پاپا کا آسرا اور سہارا میسر رہا تھا لیکن اب یوں لگ رہا تھا کہ حالات کے سخت تھپیڑوں نے یہ آسرا بھی اس سے چھین لیا ہے۔

وہ بے حد کرب کے شب و روز تھے۔ ایک طرف گھر کی فضا میں تناؤ روز بروز بڑھ رہا تھا۔ دوسری طرف راسم کے بارے میں سوچ کر اس کا دل روتا رہتا تھا۔ وہ یقیناً اذیت ناک موت کے شکنجے میں تھا۔ مر چکا تھا یا پھر مرنے والا تھا۔

www.pakistanipoint.com

جان لینے کے لیے ان ظالموں کے پاس ہزار بہانے تھے اور کشمیر کے طول وعرض میں جنگل کا قانون نافذ تھا۔ تو کیا وہ بھی فاروق والے انجام کا شکار ہونے والا تھا اور فاروق نے تو صرف فوجی گاڑیوں کی طرف پتھر اچھالے تھے، راسم کا 'جرم' تو نسبتاً بہت...... بہت بڑا تھا۔ یہ کیسا انقلاب تھا اس کے اندر۔ یہ کیسا دیوانہ انقلاب تھا۔ راسم کا نام اس کے سینے میں دھڑکن کی طرح گونجتا تھا مگر یہ انقلاب آیا کس وقت تھا؟ جب راسم موت کی دہلیز پر تھا۔ وہ اس کے لیے کیا کرسکتی تھی۔ کوئی بھی کیا کرسکتا تھا؟

ایک دن وہ بیسمنٹ میں تھی جب پاپا ایک مختلف موڈ میں اس کے پاس آئے۔ وہ دیر تک اسے سمجھاتے رہے۔ حالات کے نشیب وفراز سے آگاہ کرتے رہے۔ ''میں نے زندگی میں تم سے کچھ نہیں مانگا آنو، آج مانگ رہا ہوں۔ اس دنیا میں کسی کو مکمل آسمان نہیں ملتا ہے۔ کہیں نہ کہیں سمجھوتے کرنا پڑتے ہیں۔ یہ انکار والی ضد چھوڑ دو۔''

وہ پاپا کے کندھے پر سر رکھ کر سسک پڑی۔ ''ابھی میرے بس میں کچھ نہیں ہے پاپا! آپ مجھے کچھ وقت دیں...... چند مہینے...... میں خود کو سنبھالنے کی کوشش کروں گی پاپا۔''

''چند مہینے؟'' وہ جز بز ہو کر بولے۔ ''تمہارے سسرال والے تو چند ہفتے بھی زیادہ سمجھ رہے ہیں اور تمہاری ماما تو صبح سے یہ ضد ہیں کہ شادی ہال وغیرہ دیکھنے کے لیے نکلنا چاہیے۔''

آنیہ نے دکھی نظروں سے پاپا کو بغور دیکھا۔ ''پاپا! آپ نے ہی مجھے جھوٹ سے نفرت کرنا سکھایا ہے۔ مجھ سے اتنا بڑا جھوٹ نہ بلوائیں پاپا...... ابھی مجھ سے نہ بلوائیں پاپا۔'' وہ پھر سسکیاں لینے لگی۔

ایک روز اس نے بند کمرے میں پاپا اور فرحان کو بات کرتے سنا۔ فرحان انکشاف انگیز لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ''اروڑا کسی معمولی بندے کا نام نہیں ہے خالو جان! راجوری کے پورے ڈسٹرکٹ میں تہلکہ مچا ہوا ہے اس قاتلانہ حملے کی وجہ سے۔ میں اپنے کام کے سلسلے میں پرسوں جموں گیا تھا۔ وہاں اروڑا کا پی اے ملا۔ اس نے بتایا ہے کہ تفتیش کا دائرہ دوسرے علاقوں تک پھیلایا جارہا ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں اس معاملے میں...... خدانخواستہ...... کسی حوالے سے آنیہ کا نام آگیا تو عذاب بن جائے گا۔ میں نے کل اپنے ٹریول ایجنٹ سے بات کی ہے۔ آنیہ کا پاسپورٹ تو بنا ہی ہوا ہے نا؟''

آنیہ کے پاپا نے اثبات میں جواب دیا۔

''اگر آپ کی رائے ہو تو شادی کے فوراً بعد میں آنیہ کو لے کر لمبے ٹور پر نکل جاؤں پھر حالات دیکھ کر آئندہ کا سوچا جاسکتا ہے۔''

آنیہ کا خون کھولنے لگا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ دروازہ کھول کر اندر چلی جائے اور فرحان سے کہے کہ وہ اپنی منحوس صورت لے کر بار بار یہاں نہ آئے اور اپنے یہ قیمتی مشورے بھی اپنے پاس رکھے مگر وہ اس پر عمل نہ کرسکی۔

اسی رات آنیہ کو گیارہ بجے کے لگ بھگ ایک غیر متوقع فون کال موصول ہوئی۔ وہ حیران رہ گئی۔ یہ کال راجوری سے تھی۔ دلبر ماموں کے مسلمان ملازم خیرو کی آواز اس نے صاف پہچان لی۔ اس نے لرزتی آواز میں کہا۔ ''آنیہ بی بی! آپ کو ایک اطلاع دینا چاہتا ہوں۔''

''ہاں، ہاں بولو چاچا خیرو۔''

''بی بی جی! راسم صاحب......''

''ہاں...... کیا ہوا راسم کو؟'' وہ تڑپ گئی۔

''راسم صاحب اس وقت میرے پاس ہیں۔ بہت سخت زخمی ہیں۔ یہ ایک معجزہ ہی ہے کہ وہ اس وقت یہاں میری بیٹی کے گھر میں موجود ہیں۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو چاچا خیرو۔ راسم اور آپ کے پاس......''

''میں فون پر زیادہ بات نہیں کرسکتا۔ آپ کو اس لیے کال کی ہے کہ آپ کے ابا جان ایک بڑے وکیل ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی طرح ان کی مدد کرسکیں۔ راسم صاحب بڑی بُری حالت میں ہیں اور کسی بھی وقت دوبارہ پکڑے بھی جا سکتے ہیں...... کیا آپ اس وقت راجوری میں ہی ہیں؟''

آنیہ کا دماغ جیسے بھک سے اُڑ گیا۔ اس نے ہیجانی کیفیت پر قابو پایا اور خیرو سے چند ضروری باتیں پوچھیں۔ وہ سناٹے میں رہ گئی۔ سینے میں اس کا دل کسی مشین کی طرح چل رہا تھا۔ اس نے رسٹ واچ دیکھی۔ سوا گیارہ کا عمل تھا۔ اس نے کچھ دیر سوچا پھر بولی۔ ''چاچا خیرو، میں صبح تک تمہارے پاس پہنچ رہی ہوں۔ تم اپنا فون آن رکھو مگر اب کہیں کال نہیں کرو گے اور نہ گھر سے نکلو گے۔''

☆☆☆

آنیہ بس کے ذریعے راتوں رات جالندھر سے راجوری پہنچ گئی۔ گھر سے نکلتے وقت اس نے بس پاپا کے لیے ایک رقعہ چھوڑا تھا۔ اس میں اس نے لکھا تھا کہ اسے ایک ارجنٹ کام کے سلسلے میں شہر سے باہر جانا پڑ گیا ہے۔ اس کے

www.pakistanipoint.com

بارے میں فکر مند نہ ہوا جائے۔ جونہی موقع ملا، وہ کال کر کے اپنی واپسی کے بارے میں بتائے گی۔ اس نے پہلی بار نہار کو بھی بے خبر رکھا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اسے مسلسل سوال جواب کا سامنا کرنا پڑے اور جھوٹ بولنا پڑے۔

وہ سرتاپا ایک کریم کلر چادر میں تھی۔ صرف آنکھیں اور پیشانی کا کچھ حصہ نظر آتا تھا۔ وہ صبح آٹھ بجے کے لگ بھگ راجوری ٹاؤن پہنچ گئی۔ ایک رکشے کے ذریعے اسے مطلوبہ پتے تک پہنچنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ وہ خیرو کی بیٹی کے گھر سے کافی پہلے ہی رکشے سے اتر گئی۔ یہ ٹاؤن کا ایک مضافاتی علاقہ تھا۔ پہاڑی ڈھلوانوں پر چھوٹے چھوٹے گھر ایک دوسرے سے فاصلے پر واقع تھے۔ یہاں چنار اور چیڑ کے درختوں کی بہتات تھی۔

آنیہ کی دستک پر ڈرے ڈرے سے خیرو چاچا نے دروازہ کھولا اور آنیہ کو جلدی سے اندر بلا کر دروازہ بند کر دیا۔ یہ گھر دو چھوٹے کمروں اور ایک ڈھارا نما جگہ پر مشتمل تھا۔ فروٹ کے کچھ خالی اور کچھ بند کریٹ یہاں وہاں پڑے تھے۔ خیرو کی جواں سال بیٹی اور داماد بھی گھر میں موجود تھے۔ داماد کا نام امیر حمزہ تھا اور جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا وہ کشمیر کی تحریکِ آزادی کا ایک سرگرم کارکن تھا۔ بظاہر وہ ایک پھل فروش اور کام سے کام رکھنے والا بندہ تھا۔

''راسم کہاں ہے؟'' آنیہ نے بے تابی سے پوچھا۔

''بہت تکلیف میں ہیں۔'' خیرو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''رات دوسرے پہر سے جاگ رہے تھے، ابھی اونگھ آئی ہے۔ ویسے آپ دیکھ لیں۔'' اس نے ایک کمرے کا دروازہ تھوڑا سا کھولا۔ نیم تاریک کمرے میں میلے کچیلے بستر پر کوئی کسمسایا۔ آنیہ نے چہرے کی صرف ایک جھلک دیکھی اور اس کا کلیجا منہ کو آ گیا۔ آنکھیں سوج کر بند ہو چکی تھیں۔ ہونٹ پھٹے ہوئے اور چہرے پر بڑے بڑے نیلے داغ تھے۔ آنیہ نے جیسے کراہ کر دروازہ پھر بند کر دیا۔

رات کو خیرو چاچا نے کہا تھا، یہ ایک معجزہ ہی ہے کہ راسم صاحب یہاں موجود ہیں۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ کل شام تک آنیہ تصور بھی نہ کر سکتی تھی کہ وہ مستقبل قریب میں راسم کی کوئی خبر پا سکے گی۔ وہ ڈھارا نما جگہ پر خیرو چاچا اور اس کے داماد حمزہ کے ساتھ آن بیٹھی۔ چھوٹے سے صحن میں ایک طرف نلکے کے پاس خیرو کی بیٹی کچھ خون آلود پٹیاں دھو رہی تھی۔ یقیناً ان کا تعلق بھی راسم سے ہی تھا۔

خیرو چاچا اور امیر حمزہ نے جو کچھ بتایا، وہ واقعی تحیر خیز تھا اور کسی کرشمے کی جھلک دکھاتا تھا۔ ایک چھوٹا فوجی ٹرک، سات آٹھ ''خطرناک'' قیدیوں کو کسی جگہ سے کسی دوسرے ٹارچر سیل میں منتقل کرنے کے لیے لے جا رہا تھا۔ حمزہ کے گھر سے کوئی ایک کلومیٹر کے فاصلے پر جنگل سے گزرتے ہوئے یہ ٹرک ایک چھوٹی بارودی سرنگ سے ٹکرایا اور الٹ گیا۔ کچھ فوجی اور کچھ قیدی زخمی بھی ہوئے۔ افراتفری اور تاریکی کا فائدہ اٹھا کر تین چار قیدی موقع سے دور جانے میں کامیاب ہو گئے۔ ان میں راسم بھی تھا۔ وہ پیٹ کے بل رینگتا ہوا، خشک پتوں سے اٹے ایک گڑھے میں گرا اور نیم بے ہوشی کی حالت میں وہیں پڑا رہا۔ یہ جگہ حمزہ کے گھر سے ڈھائی تین سو میٹر دور تھی۔ حمزہ کی نظر زخمی راسم پر پڑی۔ تب وہ نہیں جان سکا کہ وہ کون ہے؟ ہاں اتنا ضرور جان گیا کہ بھارتی سورماؤں کا کوئی معتوب ہے۔ وہ اسے کمر پر لاد کر اپنے گھر لے آیا۔ راسم کو پہچاننے کے بعد اس نے اپنے سسر یعنی خیرو چاچا کو بھی اطلاع دی اور وہ بھی یہاں پہنچ گیا۔

امیر حمزہ نے کہا۔ ''علاقے میں سرچ آپریشن جاری ہے۔ ہماری بستی سے بھی ایک پارٹی ہو کر گئی ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ ہم زیادہ دیر محفوظ رہ سکیں گے۔''

خیرو چاچا نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ ''کل کی رات تو جیسے تیسے کٹ گئی ہے...... مگر مجھے نہیں لگتا کہ آج کی رات بھی کٹ سکے گی۔''

حمزہ بولا۔ ''اس کے علاوہ راسم صاحب کی حالت بھی زیادہ اچھی نہیں ہے۔ انہیں طبی امداد کی ضرورت ہے ورنہ زخم زیادہ خراب ہو جائیں گے۔'' آنیہ کی سمجھ میں فوری طور پر کچھ نہیں آ رہا تھا۔

اچانک دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ حمزہ جیسے اچھل کر رہ گیا۔ خیرو چاچا کا رنگ بھی زرد ہو گیا۔ صحن میں موجود چاچا کی بیٹی لپک کر اندر چلی گئی اور دروازہ بند کر لیا۔ دستک ایک بار پھر ہوئی۔ حمزہ نے آنیہ کو بھی اندر جانے کا اشارہ کیا اور پھر دروازے کی طرف بڑھا۔ چند لمحے بعد یہ دیکھ کر آنیہ کی جان میں جان آئی کہ دروازہ کھلنے پر اندر داخل ہونے والے ماموں دلبر سنگھ تھے۔ وہ ہمیشہ کی طرح جین شرٹ اور پگڑی میں تھے۔ وہ ہنستے مسکراتے اندر آئے اور خیرو چاچا کو دیکھ کر بولے۔ ''اوئے خیرو! او میرے سجن پیارے! تم نے تو کبھی چھٹی کیتی ہی نہیں، کل کی ہو گیا؟''

''کک...... کچھ نہیں مالک۔ بس وہ ذرا......'' خیرو گڑبڑا گیا۔

''اوئے فون پر بھی تیری آواز کچھ گھبرائی گھبرائی سی لگدی تھی۔ اسی لیے میں اِدھر سے گزر رہا تھا۔ تے سوچیا کہ

www.pakistanipoint.com

تیری خیر خبر وی لیند اجاؤں۔‘‘

تبھی ان کی نظر تکلے کے پاس رہ جانے والی چند خون آلود پٹیوں پر پڑی اور وہ بُری طرح چونک گئے۔ ’’خیرو! یہ کیا ہے بھئی؟ کسی کو سٹ شٹ (چوٹ) لگ گئی ہوئی ہے؟ اور تم سارے...... سہمے سہمے سے کیوں لگدے ہو؟‘‘

اگلے تین چار منٹ میں سب کچھ ہی ماموں دلبر پر کھل گیا۔ آنیہ کی موجودگی بھی راز نہیں رہی...... اور سب سے بڑا اور سنگین سرپرائز زخمی راسم۔ وہ ہکا بکا تھے۔ اب خیرو اور حمزہ نے بھی کچھ ان کے گوش گزار کر دیا۔ آنیہ نے بھی یہاں اپنے آنے کے بارے میں وضاحت کی۔ سب کچھ جاننے کے بعد اور راسم کی لرزہ خیز حالت دیکھنے کے بعد دلبر صاحب گہری سوچ میں کھو گئے۔ آخر گہری سانس لے کر بولے۔ ’’خیرو! تم نے یہ سب کچھ مجھ سے چھپایا۔‘‘

وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ’’مالک! مجھے ڈر تھا کہ آپ کہیں ناراض نہ ہوں۔ ویسے بھی میں اس خطرناک معاملے میں آپ کو شامل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ آنیہ بی بی کو تو اس لیے فون کیا کہ ان کے اباجی ایک بڑے قانون داں ہیں۔‘‘

’’اس کے اباجی اک وڈے قانون داں ہیں...... اور دلبر سنگھ تو ایک چوڑا چمار ہے، دو ٹکے کا بندہ۔ یہ کسی کے کام کہاں آسکدا ہے؟‘‘ دلبر سنگھ نے طنز کا تیر چھوڑا۔ خیرو چاچا ہکلا کر رہ گیا۔ دلبر سنگھ نے سینہ چوڑا کیا اور دبنگ آواز میں بولے۔ ’’یہ خون پینے والے بھارتی درندوں کا نوچا ہوا شکار ہے۔ وہ جگہ جگہ اس کی بُو سونگھتے پھر رہے ہوں گے۔ یہ جگہ کسی طرح بھی اس کے لیے محفوظ نہیں ہے۔ اس کو پناہ کی لوڑ ہے...... اور میں اسے پناہ دوں گا۔‘‘

’’مم...... مگر سرکار۔‘‘ خیرو پھر ہکلایا۔

’’اگر مگر کچھ نہیں۔ یہ میرے ساتھ جائے گا...... اور تم بھی آنیہ پُتر۔ تم لوگ دروازہ اندر سے بند رکھو۔ میں گڈی لے کے آرہا ہوں۔‘‘ وہ عزم سے بولے۔

☆☆☆

پورے چاند کی رات تھی۔ چنار کے پیڑ ہولے ہولے خنک ہوا میں لہرا رہے تھے۔ آنیہ، زخمی راسم کے بستر کے قریب موجود تھی۔ دلبر ماموں نے اپنے لیے سخت ترین خطرات مول لیتے ہوئے بھی راسم کو پناہ دی تھی۔ وہ ان کے ہی گھر میں موجود تھا مگر یہ گنجان آبادی کا وہ گھر نہیں تھا جہاں وہ اور نہار رہتی رہی تھیں۔ یہ دریائے تاوی کی دوسری جانب قدرے کشادہ علاقے میں دو منزلہ گھر تھا۔ اچھا بنا ہوا تھا۔ یہاں زیادہ تر گھر ایک کینال کے تھے یا اس سے بڑے تھے۔ دو مساجد کے بلند مینار نظر آتے تھے۔ ایک کالج کا بوائز ہاسٹل تھا۔ جس کے قریب ایک پلے گراؤنڈ تھا اور ایک بڑا باغ تھا۔ اس علاقے کو مقامی لوگ ’’باغ‘‘ کے نام سے پکارتے تھے۔ آنیہ پچھلے دس روز سے یہاں راسم کے ساتھ موجود تھی۔ وہ شروع میں تو راسم کی طرف نظر بھر کر دیکھتی ہی نہیں تھی۔ ان کا دل خون ہونے لگتا تھا۔ ظالموں نے بے پناہ تشدد کیا تھا اس پر۔ پورا چہرہ سوجا ہوا تھا۔ ہونٹ کٹ گئے تھے۔ جبڑے کو نقصان پہنچا تھا۔ وہ کوشش کر کے بڑی مشکل سے ایک دو الفاظ ہی بول سکتا تھا۔ ایک دن آنیہ نے اس کی ٹانگیں اور پاؤں دیکھے تو خود کو بمشکل رونے سے روک سکی تھی۔ اس کی رانوں پر یقیناً رولر پھیرا گیا تھا۔ وہاں بڑے بڑے نیل تھے اور خون جم کر رہ گیا تھا۔ اب آٹھ دس روز گزر چکے تھے پھر بھی اس کے پاؤں پر ورم موجود تھا۔ اس کے تلوؤں پر اتنی ضربات لگائی گئی تھیں کہ اندر سے گوشت پھٹ گیا تھا۔ تاحال اندرونی ضربات کی وجہ سے اسے پیشاب کرنے میں سخت دقت محسوس ہوتی تھی۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اسے صرف سیال خوراک دی جارہی تھی۔ اس مسلمان ڈاکٹر کا انتظام دلبر ماموں نے ہی کسی طرح کیا تھا۔ انہیں ان ڈاکٹر صاحب پر پوری طرح اعتماد تھا۔ وہ روزانہ کم از کم ایک مرتبہ ضرور آتے تھے...... راسم کے زخموں کو ٹریٹ کرتے تھے اور انجکشن وغیرہ لگاتے تھے۔

اسی دوران میں کمرے کے دروازے پر دلبر ماموں نمودار ہوئے۔ انہوں نے اشارے سے آنیہ کو باہر بلایا۔ دلبر ماموں بھی آج کل اسی گھر میں قیام پذیر تھے۔ تاہم خیرو پہلے والے گھر میں تھا۔ ماموں کسی وقت وہاں کا چکر لگا آتے تھے۔ یہاں کھانا وغیرہ آنیہ ہی پکا رہی تھی۔ دوسرے کمرے میں جا کر دلبر ماموں نے کہا۔ ’’دھی رانی! ابھی تمہاری ماما کا فون پھر آیا ہے۔ وہ بار بار مجھ سے تمہارے بارے وچ ہی پوچھتی ہیں۔ مجھے بار بار جھوٹ بولنا پڑ رہا ہے۔ آج تو وہ رونے ہی لگ پڑیں۔ کہنے لگیں کہ ویر جی! کسی بھی طرح آنو کو تلاش کرو۔ ہم نے تو اس کی شادی کے دن رکھے ہوئے تھے۔‘‘

’’دلبر ماموں! آپ پریشان نہ ہوں۔ میں نے تو آپ سے کہا تھا کہ آپ بے شک ان کا فون ہی نہ سنیں۔ میں جانتی ہوں وہ ’’اوور ری ایکٹ‘‘ کر رہی ہیں۔ ورنہ پاپا کو میں فون پر پوری تسلی دے چکی ہوں اور وہ بڑی حد تک میری بات سمجھ بھی چکے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ میں راجوری کے آس پاس ہی کہیں موجود ہوں اور پوری طرح خیریت سے

www.pakistanipoint.com

ہوں۔''

''تم نے راسم کے بارے میں انہیں کچھ نہیں بتایا؟''

''نہیں...... مگر اس وجہ سے کہ یہ راسم کی سیکیورٹی کا معاملہ ہے۔ ورنہ ماموں، وہ بھی میرے اور راسم کے بارے میں تقریباً سب کچھ جان چکے ہیں۔''

دلبر ماموں نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔ ''یعنی وہ جان چکے ہیں...... کہ تم راسم میں انٹرسٹ لے رہی ہو؟''

''ہاں ماموں۔'' وہ بے باکی سے بولی۔ ''پاپا نے ہمیشہ مجھے سچ بولنا سکھایا ہے اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ سچ کبھی کبھی بہت تلخ ہوتا ہے۔ ان کی تربیت کے مطابق میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اب اپنی زندگی کا سب سے بڑا جھوٹ کیسے بول دوں۔ کیسے کہہ دوں کہ خالہ زاد فرحان مجھے بطور شوہر قبول ہے؟ وہ مجھے قبول نہیں ہے دلبر ماموں۔''

دلبر ماموں گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے رہے، جیسے اس کی بے باک، سیلانی طبع کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ تب طویل سانس لے کر بولے۔ ''مجھے لگدا ہے میری یہ دھی رانی ایک بڑے کٹھن رستے پر چل پڑی ہے۔ اس رستے پر کانٹے ہی کانٹے ہیں۔ راسم اب ان لوگوں کی ہٹ لسٹ پر اوپر کے ناموں میں آچکا ہے...... رب کرے کوئی چمتکار ہو جائے، ورنہ وہ اسے چھوڑیں گے نہیں۔ میری سمجھ وچ تو تمہاری یہ باتیں بالکل نہیں آرہی ہیں۔''

''زندگی موت تو اس اوپر والے کے ہاتھ میں ہے ماموں! اور آپ بھی مانتے ہیں کہ راسم اور اس جیسے دوسرے لوگ برسوں جس ''کاز'' کے لیے تکلیفیں سہہ رہے ہیں، وہ اب فائنل اسٹیج پر ہے۔ اب اس کشتی نے کسی نہ کسی کنارے لگنا ہے۔''

دلبر سنگھ جی نے کھوئے لہجے میں کہا۔ ''رب سوہنے نے چاہا تو لگے گی کنارے...... اور سب کی کنارے لگیں گی۔''

پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے گویا ہوئے۔ ''دیکھو کیا الٹ پھیر ہے۔ اس جلیانوالا باغ کی تصویر کا تعلق شہابی حیدر سے ہے۔ ہم اسے کیا سمجھتے تھے اور وہ کیا نکلا ہے۔ راسم ہمارے نزدیک آوارہ گرد اور اجڈ تھا مگر اس نے وہ کام کیا ہے جو ''شیر بچے'' کی نسل میں سے کسی کو کرنا چاہیے تھا۔ تمہیں پتا ہے کہ راسم کی گرفتاری کے وقت کیا ہوا تھا؟''

''مجھے تو وہی پتا ہے جو خبروں میں آیا ہے۔''

''خبروں میں یہ نہیں آیا نا کہ اس نے خالی ہتھ تین بھارتی فوجیوں کو مار مار کر ان کا بھرکس نکال دیا تھا۔ وہ تو ان کی خوش قسمتی کہ ایک فوجی کے سروس پسٹل سے گولی چل گئی اور آواز سن کر کچھ اور فوجی بھی وہاں پہنچ گئے۔ دست بدست لڑائی وچ اس دن گن ایک کھڈے وچ گر گئی تھی نہیں تو اس نے چھاننی کر دینے تھے آٹھ دس بندے......''

اسی دوران میں اندر سے کراہنے کی آواز آئی۔ ''دیکھو اسے۔'' دلبر ماموں نے کہا۔

آنیہ لپک کر اندر گئی۔ راسم تکیے سے اپنا سر اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ آنیہ نے فوراً اس کے سر کے نیچے ایک کشن رکھا۔ نیند میں غالباً اس کا دایاں ہاتھ میز سے ٹکرایا تھا۔ اس ہاتھ کی دو انگلیاں ٹوٹ چکی تھیں اور زخم تھے۔ ہاتھ ٹکرانے سے خون رس آیا تھا۔ ''یہ آپ نے کیا کیا؟'' آنیہ تڑپ کر بولی۔

راسم نے مچی مچی نظروں سے اُسے دیکھا۔ ''اوگاڈ...... اوگاڈ...... آپ ابھی تک گئی نہیں؟'' وہ کربناک انداز میں اٹک اٹک کر بولا۔ ''آپ کیوں...... خود کو اور...... اپنے گھر والوں کو عذاب میں ڈال رہی ہیں؟''

وہ اس کی زخمی انگلیوں پر نئی پٹی لپیٹتے ہوئے بولی۔ ''میں نے آپ سے کہا ہے نا، مجھے کہیں نہیں جانا۔ میں نے پاپا کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ آپ اس بارے میں سوچ سوچ کر پریشان نہ ہوں۔''

اس نے سخت بے قراری میں سر کو دائیں بائیں ہلایا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر آواز نے ساتھ نہیں دیا۔ وہ بُری طرح کھانسنے لگا۔ آنیہ اس کے بالوں بھرے فراخ سینے پر ہاتھ چلانے لگی۔ اسے تھپکنے لگی۔ کھانسی کی شدت کم ہو گئی مگر کھانسی پوری طرح ختم نہیں ہوئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھنا چاہ رہا تھا۔ آنیہ نے اسے سہارا دے کر بٹھایا اور عقب میں بیٹھ کر اسے اپنے جسم کی ٹیک فراہم کی۔ کچھ دیر بعد وہ نارمل ہو گیا۔ ''آنیہ میری زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ تم اور دلبر سنگھ خود کو کیوں مار رہے ہو میرے ساتھ...... مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ اگر زیادہ ہمدردی امڈ رہی ہے تو کسی طرح راجا کو اطلاع کر دو۔''

''میں نے آپ کو صبح بھی بتایا تھا راسم۔ راجا سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ لگتا ہے کہ وہ بھی پکڑا گیا ہے یا پھر روپوش ہو گیا ہے۔ مجھے تو سدرہ کی فکر ہے۔ آپ نے ابھی تک اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''

''اسے میں نے گرفتاری سے پہلے وہاں سے نکال دیا تھا۔'' وہ اٹک اٹک کر بولا۔ ''وہ محفوظ جگہ پر ہے۔'' کھانسی کی وجہ سے راسم کے مضروب سینے میں درد ہونے لگا تھا۔ وہ ہولے ہولے کراہنے لگا۔ آنیہ اس کے عقب میں بیٹھی تھی۔ بازو آگے کر کے ایک بار پھر اس کا سینہ سہلانے لگی۔ گاہے

www.pakistanipoint.com

گاہے وہ اس کے سر کے اُلجھے بالوں میں انگلیاں چلاتی تھی۔
وہ دھیمی آواز میں رک رک کر بولنے لگا۔ ''آنیہ میرے دل میں آپ کا مقام بڑا اونچا ہے۔ خود کو اسی مقام پر رہنے دیں۔ میں نے آپ کو بہت چاہا ہے مگر آپ کی قربت کی خواہش کبھی نہیں کی۔ میں...... کبھی بھی آپ کی ان عنایتوں کے قابل نہیں تھا اور اب تو بالکل بھی نہیں ہوں۔ مم...... میری وجہ سے آپ پر کوئی مصیبت آئی تو میں...... مر کر بھی چین نہ پاسکوں گا۔ پلیز آپ چلی جاؤ یہاں سے۔''
''راسم! آپ خود کہتے ہیں، زندگی موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اگر میرے مقدر میں کوئی تکلیف لکھی ہے یا موت آنی ہے تو وہ سات دروازوں کے پیچھے بھی آسکتی ہے۔''
وہ جیسے کراہ کر رہ گیا۔ اس میں بولنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ وہ اس کے بالوں میں اپنی حنائی انگلیاں چلاتی رہی۔ وہ اسی طرح بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگا...... پھر سو گیا۔ وہ اسی طرح اسے بازوؤں میں لیے بے حرکت بیٹھی رہی۔ کبھی کبھی اس کے سر کے بالوں پر پیار سے بوسہ دیتی رہی۔ وہ انوکھی لڑکی تھی۔ اس نے ایک انوکھے وقت میں، انوکھی محبت کی تھی۔ دور کہیں وادی میں فائرنگ کی آواز آرہی تھی۔ آری کے تُوگیر کُتّے شور مچا رہے تھے...... چنار زخمی ہو رہے تھے۔

☆☆☆

ڈاکٹر ابھی راسم کو دیکھ کر گیا تھا۔ اس کی حالت بہتر ہو رہی تھی مگر سینے پر لگی ہوئی چوٹیں تکلیف دیتی تھیں اور تلوے اس بُری طرح زخمی تھے کہ اس کے لیے پاؤں پر کھڑے ہونا مشکل تھا۔ شروع میں تو اس سے ایک لفظ بولنا بھی مشکل تھا مگر اب وہ اٹک اٹک کر بول لیتا تھا۔ آنیہ کے بے حد اصرار پر وہ اسے اپنی قید و بند کے حالات بتا رہا تھا۔
''پکڑا تو فوجیوں نے ہی تھا مگر پھر وہ کسی نجی ٹارچر سیل میں لے گئے تھے۔ وہاں وہ بدبخت اروڑا ابھی دو تین بار آیا۔ ایک بار وہ ٹھیکیدار نرائن بھی اس کے ساتھ تھا۔ اروڑا کو تو مجھ سے کئی تکلیفیں ہیں مگر ٹھیکیدار نرائن کو سب سے بڑی پریشانی اور تکلیف یہی ہے کہ میں نے شادی شدہ جوڑے (ظہیر اور نادیہ) کو کہاں چھپایا ہے۔''
''اروڑا کو کیا کیا تکلیفیں ہیں؟'' آنیہ نے اس کی پیشانی کو گیلے کپڑے سے صاف کرتے ہوئے پوچھا۔
''ظاہر ہے کہ سب سے بڑی تکلیف تو یہی قاتلانہ حملے کی کوشش ہے پھر اسے ابھی ظہیر اور نادیہ والا دکھ ابھی بھولا نہیں۔ اسے اس بات کی بھی ہمیشہ رنجش رہی ہے کہ میں نے اس کی سابقہ بیوی...... یا کہہ لیں کہ...... سابقہ مظلومہ، سدرہ کو اپنے پاس پناہ دے رکھی ہے۔ اروڑا مجھ سے نادیہ اور ظہیر کے علاوہ سدرہ کا اتا پتا جاننے کی کوشش بھی کرتا رہا ہے۔ وہ اپنے ہاتھوں سے مجھے الیکٹرک شاک دیتا رہا ہے اور بولنے پر مجبور کرتا رہا ہے۔ ایک دن اس نے مجھے بے لباس کر کے برف کے بلاک پر لٹا دیا۔ میں اس دن، تین روز کے فاقے سے تھا۔ اس نے زبردستی میرے منہ میں شراب انڈیلی اور سؤر کا گوشت کھلانے کی کوشش کرتا رہا......''
آنیہ اب گیلے کپڑے سے راسم کے پاؤں صاف کر رہی تھی۔ ان کا ورم ابھی تک پوری طرح ختم نہیں ہوا تھا۔ پاؤں دیکھ کر آنیہ کا دل رونے لگتا تھا۔ ایسی سفاکی، ایسی سنگدلی؟ پاؤں پر کئی جگہ چھوٹے چھوٹے سیاہی مائل نشان تھے۔ یہ الیکٹرک شاک کی نشانیاں تھیں۔ وہ اپنے نرم ہاتھوں سے اس کے پاؤں سہلانے لگی۔ اس نے پاؤں سمیٹ لیے۔
''ایسا نہ کیا کریں آنیہ۔'' وہ کراہا۔
اسی دوران میں تیز قدموں کی آہٹ سنائی دی اور پھر دروازے پر چھوٹی سی دستک کے بعد دلبر سنگھ اندر داخل ہوئے۔ آج ملازم خیرو بھی ان کے ساتھ تھا۔ وہ آتے ہی بولے۔ ''آنیہ، خطرہ بڑھ گیا ہے۔ اب راسم پُتر کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ دو چار دن کے لیے تم نیچے چلے جاؤ۔''
''نیچے کہاں ماموں؟'' آنیہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔
''بتاتا ہوں۔ تم ضروری چیزیں سمیٹو۔'' وہ بولے۔ پھر خیرو کو اشارہ کیا۔ وہ بھی آنیہ کا ہاتھ بٹانے لگا۔ خیرو اور دلبر سنگھ جی نے راسم کو دونوں طرف سے سہارا دے کر بمشکل اٹھایا اور پھر آہستہ آہستہ چلاتے ہوئے ایک عقبی کمرے میں لے آئے۔ ایک چھوٹا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ آنیہ نے پہلی بار دیکھا کہ یہاں سے ایک تنگ سا زینہ نیچے جا رہا تھا۔
چند منٹ بعد آنیہ اور راسم ایک چھوٹے سے تہ خانے میں تھے۔ ''لگتا تھا کہ دلبر ماموں نے ہنگامی بنیادوں پر یہاں راسم اور آنیہ کے قیام کا انتظام کیا ہے۔ راسم بستر پر لیٹ گیا اور اس کی سانسیں کچھ بحال ہوگئیں تو خیرو کو اس کے پاس چھوڑ کر دلبر ماموں، آنیہ کو باہر لے آئے بولے۔ ''دھی رانی! راجوری میں ہر تھاں (جگہ) راسم کی تلاش ہو رہی ہے۔ دیواروں پر بڑے بڑے پوسٹر لگا دیے گئے ہیں۔ ان پر راسم کی تصویر بھی ہے۔ اسے ایک بڑے دہشت گرد کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہمارے محلے میں بھی ایک جیپ آکر رکی ہے۔ دس بارہ فوجی ہیں اس کے اندر۔ سنا ہے کہ گھروں کی تلاشی وغیرہ لیں گے۔''
آنیہ جیسے اندر تک لرز گئی۔ ''اب کیا ہو گا دلبر

www.pakistanipoint.com

ماموں؟''

دلبر ماموں سینہ تان کر بولے۔ ''اوئے، میرے ہوندے ہوئے میری دھی رانی کو چنتا کرنے کی کیا لوڑ ہے۔ ایسی کم تیسی ان گیدڑوں کی۔ کوئی تم دونوں کی ہوا کو بھی تو چھو کر دکھائے۔ بس تم دونوں نے تسلی سے یہاں بیٹھے رہنا ہے۔ کوئی کُتّے دا پتر آیا تو سنبھال لوں گا اس کو میں۔''

اس روز تو خیریت ہی گزری۔ وہ رات ان دونوں نے اس چھوٹے سے کمرے میں گزاری۔ یہاں لوہے کی ایک بڑی الماری کے علاوہ ایک چھوٹا بیڈ اور ایک صوفہ تھا۔ ایک اٹیچ باتھ بھی تھا جس میں سیویج مشین لگی ہوئی تھی۔

اگلے روز نو بجے کے لگ بھگ جب آنیہ، راسم کو ناشتا کرا رہی تھی، یکا یک اوپر تہ خانے کی چھت پر بھاری بوٹوں کی دھمادھم سنائی دی۔ دروازوں کے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آئی۔ آنیہ نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یا اللہ خیر۔''

راسم بھی تناؤ میں دکھائی دینے لگا۔ آنیہ سیڑھیاں چڑھ کر بیسمنٹ کے دروازے کے قریب پہنچی اور کان لگا کر سننے لگی۔ مدھم آوازیں اس کے کانوں تک پہنچنے لگیں۔

''سرچ وارنٹ کے بغیر یہ سب ٹھیک نہیں ہوندا لفٹین صاحب! آپاں نے بھی فوج کی نوکری بھگتی ہوئی ہے۔ قانون شانون کی تھوڑی بہت جانکاری آپاں کو (ہم کو) بھی ہے۔'' یہ دلبر ماموں کی آواز تھی۔

''اچھا تو جناب بھی فوج میں تھے؟'' لیفٹیننٹ کی آواز آئی۔

''آپ تو ایسے حیرانی سے کہہ رہے ہیں جیسے کسی سکھ کو فوج میں دیکھا ہی نہیں۔ اپنی فوج میں ہم سکھوں کے علاوہ اور ہے ہی کیا؟''

''کیا مطلب؟'' آرمی آفیسر کی آواز تلخ تھی۔

''مطلب کا پتا تم کو اس وقت چل جائے گا جب خالصے فوج کو چھوڑ گئے، جب انڈین فوج کو ''ہم خالصوں'' کے بغیر پاکستان اور چین سے پنجہ لڑانا پڑا۔'' چند سیکنڈ بعد دلبر سنگھ جی بلند آواز میں ہنسے۔ ''لفٹین صاحب! آپ کا تو رنگ پھیکا پے گیا ہے۔ میں تو ویسے ہی اِک گل کر رہا تھا۔ رب کرے ہماری گورنمنٹ کو عقل آجائے...... اور اقلیتوں پر اپنا ہتھ ذرا ہولا کرلے، آپ سمجھو کہ اک طوفان ہے جو اندر ہی اندر پل رہا ہے۔''

لیفٹیننٹ کے بڑبڑانے کی آواز آئی۔ کچھ دیر بعد وزنی بوٹوں کی دھمادھم بیرونی دروازے کی طرف چلی گئی۔

آنیہ طویل سانس لے کر واپس راسم کی طرف آگئی۔ وہ جانتی تھی کہ قریباً بیس سال پہلے دلبر سنگھ جی نے بطور کیپٹن فوج کی نوکری کیوں چھوڑ دی تھی، ان کی سوچ وہی تھی جس کی ایک جھلک اس گفتگو میں دکھائی دی تھی اور یہ حقیقت بھی تھی کہ انڈیا کی فوج نے ہمیشہ سکھوں کے بل بوتے لڑائیاں لڑی تھیں۔ وہی سکھ جنہیں گولڈن ٹیمپل میں سیکڑوں کی تعداد میں بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا اور پھر اندرا کے قتل کے بعد سڑکوں پر زندہ جلایا گیا تھا۔ بہت سے زخم بظاہر بھر جاتے ہیں مگر اندر سے کچے رہتے ہیں، رستے رہتے ہیں۔ تین ہفتے پہلے جب آنیہ جالندھر سے چلی تھی، اس نے اپنی پرانی سم نکال کر پھینک دی تھی اور فون آف کر دیا تھا لیکن اب اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بذریعہ فون، کم از کم نہار سے رابطہ کرے اور اس سے گھر کے حالات جاننے کی کوشش کرے۔ کل اس نے دلبر ماموں سے کہہ کر نئی سم کا انتظام کرایا تھا۔ سہ پہر کو فون آن کر کے اس نے سب سے پہلے نہار کور کا نمبر ہی ملایا۔ اس کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ تیسری چوتھی کوشش پر نہار نے کال ریسیو کر لی اور آنیہ کی آواز پہچان کر ششدر رہ گئی۔ چند سیکنڈ میں اس نے کوئی نصف درجن سوال آنیہ سے کر ڈالے۔ ان سوالوں کے جواب میں آنیہ نے اسے بس یہی بتایا کہ وہ راجوری میں ایک جگہ موجود ہے اور بالکل خیریت سے ہے۔

''راجوری میں کس جگہ؟'' نہار نے بے تابی سے پوچھا مگر پھر خود ہی اپنے سوال کو کینسل کر دیا۔ ڈھیلے لہجے میں بولی۔ ''نہیں رہنے دو۔ یہ جانکاری مجھے نہ ہی دو تو اچھا ہے۔''

''میں بھی یہی چاہتی ہوں نہار، یہ میرے لیے بہتر ہے اور تمہارے لیے بھی۔''

چند لمحے تک دونوں کے درمیان گمبھیر خاموشی طاری رہی پھر نہار نے ٹھہرے ہوئے بوجھل لہجے میں کہا۔ ''آنیہ! تمہارے لیے ایک اہم سماچار ہے...... فرحان کی ڈیتھ ہوگئی ہے۔''

''کیا؟'' آنیہ تقریباً چلاّ پڑی۔ اسے سخت شاک لگا تھا۔ وہ سکتہ زدہ سی ہوگئی۔

اس خبر پر یقین کرنے میں اسے کچھ دیر لگی۔ نہار نے جو کچھ بتایا اس سے انکشاف ہوا کہ یہ واقعہ پانچ دن پہلے ہوا ہے۔ معمولی بات پر فرحان کا کسی سے جھگڑا ہوا۔ بات بڑھ گئی اور مخالف فریق نے اس پر فائر کر دیا جو سیدھا سینے میں لگا۔

www.pakistanipoint.com

''کون تھا وہ؟'' آنیہ نے دکھ سے پوچھا۔

''بس کوئی راہ گیر تھا۔'' نہار نے جواب دیا۔ پھر کچھ توقف کرنے کے بعد ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔ ''کہتے ہیں ناں کہ اوپر والے کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ کسی وقت تو مجھے لگتا ہے آنیہ جانی، کہ فرحان پر بھی یہ لاٹھی ہی پڑی ہے۔ وہ اپنی حد سے آگے جا رہا تھا۔''

''یہ بات تم کیوں کہہ رہی ہو نہار؟''

''تم تو وہاں بیٹھی ہو۔ تمہیں کیا جانکاری کہ یہاں کیا ہوتا رہا ہے...... فرحان خطرناک ہتھکنڈوں پر اترا ہوا تھا۔ چھ سات روز پہلے وہ مجھ سے بھی ملا۔ اس کو شک تھا کہ مجھے کچھ نہ کچھ تمہارا پتا ٹھکانا معلوم ہے۔ اس نے مجھے صاف سیدھے لفظوں میں دھمکی دی کہ ریٹائرڈ کرنل اروڑا سے اس کے سمبندھ ہیں۔ اگر میں نے اسے تمہارا اتا پتا نہیں بتایا تو وہ بالآخر اروڑا کو بتانے پر مجبور ہو جائے گا کہ آنیہ کا اس بھگوڑے راسم سے ملنا جلنا تھا اور یہ وہی ہے جس نے آنیہ کو عین شادی سے پہلے جالندھر سے بھگایا ہے۔'' کچھ مزید تفصیل بھی نہار نے بتائی۔

آنیہ سناٹے میں رہ گئی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ اس کا خالہ زاد اس حد تک گر سکتا ہے۔ نہار نے مزید کہا۔ ''تمہیں یہ سن کر حیرانی ہوگی کہ اس نے ایک دن پہلے یہی دھمکی تمہارے پاپا کو بھی دی تھی...... اور ساتھ میں انہیں ایک ہفتے کی مہلت کا بھی کہا تھا۔ شاید اسی کو رب کی کرنی کہتے ہیں۔ مہلت سے پہلے اس کی اپنی مہلت ختم ہوگئی۔ دس پندرہ روز پہلے اس نے نئی گاڑی نکلوائی تھی۔ اس پر جا رہا تھا۔ تھوڑی بہت پی پلا بھی رکھی تھی۔ راستے میں ایک موٹر بائیک والا گاڑی کی سائڈ سے ٹکرایا اور دروازے پر اسکریچ ڈال دیا۔ بس اسی اسکریچ سے بات بڑھی اور فرحان کے پران لے گئی۔ فرحان نے مشتعل ہو کر بائیک والے کو تھپڑ مارا۔ اس نے پستول نکال کر سیدھا فائر کر دیا۔''

آنیہ ششدر تھی۔ نمود و نمائش کو بے پناہ اہمیت دینے والا، آخر نمود و نمائش کی بھینٹ ہی چڑھ گیا تھا۔ دھمکی والی جو بات نہار نے بتائی تھی، وہ کبھی کبھی آنیہ کے دماغ میں بھی آئے بغیر نہیں رہتی تھی۔ وہ سوچتی تھی، کہیں کوئی ایسی اسٹیج نہ آ جائے کہ فرحان اپنی اصلیت بتانے پر تل جائے۔ اس کے زیادہ تر یارانے ہندو امیر زادوں سے ہی تھے۔ اپنے طور طریقوں میں بھی وہ بس نام ہی کا مسلمان تھا۔ نہار نے آنیہ کو بتایا کہ آنیہ کے گھر والوں کو بھی فرحان کی اس اچانک موت کا صدمہ تو ہوا ہے لیکن فرحان کی اصلیت چونکہ ظاہر ہو چکی تھی اس لیے اس واقعے میں شاید کہیں راحت کا ایک پہلو بھی ہے۔

اگلے روز دل بہت کڑا کر کے آنیہ نے پاپا سے کال ملائی۔ پاپا بھی اس رابطے پر ششدر ہوئے۔ آنیہ نے انہیں اپنی خیر خیریت سے آگاہ کیا اور ساتھ ہی ایک بار پھر یہ یقین دہانی کرائی کہ وہ ان کی تربیت میں پروان چڑھنے والی بیٹی ہے۔ کسی بھی جگہ ہو، اپنی عزت و ناموس کی حفاظت کرے گی۔ وہ واضح طور پر آنیہ سے بہت خفا تھے۔ اس کے دس فقروں کے جواب میں ایک آدھ لفظ ہی بول رہے تھے۔ آنیہ نے فرحان کی ناگہانی موت پر دلی افسوس کا اظہار کیا۔ اس موقع پر پاپا سے ایک دو فقروں کا تبادلہ ہوا۔ ان کی بات سے پتا چلا کہ کم از کم وہ اس بات کے قائل تو ہو چکے ہیں کہ آنیہ کو فرحان کی دلہن بنانے والی سوچ بالکل غلط تھی۔ وہ اس قابل ہرگز نہیں تھا۔ آٹھ دس منٹ کی گفتگو میں پاپا نے آنیہ سے نہیں پوچھا کہ وہ کہاں ہے، نہ ہی آنیہ نے بتایا۔ شاید دونوں ہی یہ بات سمجھ رہے تھے کہ اس حوالے سے فی الحال خاموش رہنا بہتر ہے۔

سات آٹھ روز ہو چکے تھے۔ آنیہ اور راسم مسلسل اسی چھوٹے سے بیسمنٹ میں تھے۔ آنیہ بس کسی وقت کسی ضروری کام سے ہی باہر نکلتی تھی۔ راسم کسی وقت گم صم سا ہو جاتا تھا۔ اسے اس بات کا قلق تھا کہ اس کی آرزو پوری نہ ہو سکی۔ وہ فاروق کو اس کی سالگرہ پر اپنا من چاہا تحفہ نہ دے سکا۔ اپنی وہ رائفل کھو جانے کا بھی اسے بہت دکھ تھا جو اس نے بہت جتن کر کے حاصل کی تھی۔ دیگر حالات جوں کے توں تھے۔ خیر واب مستقل طور پر اس گھر میں شفٹ ہو چکا تھا۔ کھانا پکانا وہی کر رہا تھا۔ دلبر ماموں کا زیادہ وقت بھی اسی پُرسکون کوٹھی میں گزر رہا تھا۔ وہ ہر حال میں خوش رہنے والے اور خوش خوراکی سے ناتا نہ توڑنے والے شخص تھے۔ اس کوٹھی کے آس پاس بھی زبردست تناؤ موجود تھا۔ گرد و نواح میں پولیس گاڑیوں کے سائرن سنائی دیتے رہتے تھے۔ کسی وقت کہیں سے اکا دکا فائر کی آواز بھی آ جاتی تھی۔ اس کے باوجود دلبر ماموں اپنے حال میں مگن رہتے تھے۔ وہ تہ خانے سے باہر آئی تو شام گہری ہو چکی تھی۔ دلبر ماموں ایک بڑی تھالی میں موتی چور کے لڈو رکھے اہتمام سے کھا رہے تھے۔ ''یہ کیا ہے ماموں؟'' آنیہ نے ذرا ناراضگی سے کہا۔

وہ جواب میں بولے۔ ''حیرت کی گل ہے بھئی جالندھر کی لڑکی موتی چور دیکھ کر کہہ رہی ہے کہ یہ کیا ہے؟''

www.pakistanipoint.com

ماموں۔ بھئی جالندھر کا موتی چور لڈو تو ولایت تک مشہور ہے۔''

''مگر آپ کی ڈائٹنگ؟''

''ڈائٹنگ والے فلسفے پر میں نے کافی غور کیتا ہے دھی رانی۔ دراصل بندہ صرف خوراک کھانے سے ہی تو موٹا نہیں ہوندا ہے اور بھی کئی اک چیزیں ہیں۔ اب دیکھو خوشی بھی تو بندے کو موٹا کرتی ہے نا۔ اب ذرا سوچو یہ امان اللہ اور سہیل احمد کے اسٹیج ڈرامے بھی تو نرا ''ہاسا'' اور نری خوشی ہی ہیں ناں۔ میں کھانا چھڈ بھی دوں لیکن یہ ڈرامے تو نہیں چھڈ سکدا۔ اس کا مطلب ہے موٹا تو میں نے ہونا ہی ہونا ہے......''

دلبر ماموں کی بات کو ایک دم بریک لگ گئے۔ کسی فوجی گاڑی کا تیز ہوٹر سنائی دیا تھا۔ دونوں ساکت بیٹھے یہ آواز سنتے رہے پھر گاڑی آگے نکل گئی۔ دلبر ماموں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''بھائیا خورشید عالم سے بات ہوئی؟''

''ہاں ماموں، دو تین دفعہ رابطہ ہوا ہے۔ کچھ نرم تو ہو گئے ہیں......مگر......''

''اوئے، ہو جائے گا......ضرور ہو جائے گا نرم۔ تیرے پریم میں شکتی ہے اور مجھے وشواس ہے، یہ شکتی ایک دن ضرور کام دکھائے گی۔ ویسے بھی پاپا تیرا دل کا بہت چنگا بندہ ہے۔ ایسے لوگ یہ بات چنگی طرح سمجھدے ہیں کہ جیون صرف اِک دار ملدا ہے۔ اس کو دل کی بات مان کر گزارنا چاہیے۔ سنسار جو کہے وہ کہندا رہے۔''

آنیہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ پھر انہوں نے ذرا توقف کر کے آنیہ سے پوچھا۔ ''اور انہوں نے تیرے بارے میں دوسروں کو کیا بتایا ہوا ہے کہ آنیہ کہاں ہے؟''

''یہی کہ فائن آرٹ کا ایک کورس کرنے کے لیے دہلی گئی ہوئی ہے۔''

کچھ دیر بعد جب آنیہ بے آواز چلتی ہوئی تہ خانے کی سیڑھیوں پر پہنچی تو راسم جاگ رہا تھا اور اس نے تکیے سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ آہٹ سن کر وہ چونک گیا اور آنیہ کو لگا جیسے اس نے جلدی سے کوئی چیز تکیے کے نیچے چھپائی ہے۔ وہ راسم کے پاس آن بیٹھی اور اس کے زخمی ہاتھ کے ناخن ..... بڑی احتیاط سے تراشنے لگی۔ اسی دوران میں اس نے صفائی سے کاغذ کا ایک ٹکڑا راسم کے تکیے کے نیچے سے نکال لیا۔ وہ جز بز ہو کر رہ گیا۔ یہ قریباً چار انچ ضرب دس انچ کا ایک رنگین اسٹیکر تھا۔ شاید خیرو کہیں باہر سے لے کر آیا تھا۔ اس پر ٹوٹی ہوئی زنجیر کی تصویر تھی۔ نیچے ایک نعرہ درج تھا۔ ہم نہیں مانتے..... ظلم کے ضابطے۔ اس نعرے کے ساتھ راسم نے اپنے انگوٹھے کے تازہ نشان سے مہر تصدیق ثبت کی تھی۔ یہاں روشنائی تو نہیں تھی، بس اس کا خون تھا جو مختلف زخموں سے رس کر پٹیاں بھگوتا رہتا تھا۔ ایسے ہی کسی زخم سے انگوٹھا تر کر کے اس نے یہ نشان لگا دیا تھا۔

''کیا جدوجہد کا کوئی اور راستہ نہیں؟'' آنیہ نے کھوئے کھوئے لہجے میں پوچھا۔

''میرے لیے اب یہی راستہ رہ گیا ہے آنیہ۔ مجھے مارنا ہے یا مر جانا ہے۔ میرا فاروق ہر روز مجھ سے پوچھتا ہے، کیا ایک نعرہ نہ لگانے کی سزا اتنی ہی کڑی ہوتی ہے۔ کیا میری جان اتنی ہی سستی تھی؟ میرا قاتل اتنا طاقتور کیوں ہے؟ وہ کیوں اب تک اس زمین کے سینے پر دندناتا پھر رہا ہے؟ مجھے اپنے فاروق کو جواب دینا ہے، آنیہ! مجھے آخری سانس تک کوشش کرنی ہے۔''

''مگر...... وہ فی الحال آپ کی پہنچ سے دور ہے، دیوار سے ٹکرا کر خود کو شدید نقصان پہنچا لینا کہاں کی دانشمندی ہے راسم؟''

''کچھ قلعوں کو سر کرنے کے لیے بار بار جان کی بازی لگانا پڑتی ہے۔ سومنات پر بھی تو کسی نے اَن گنت حملے کیے تھے۔''

وہ خاموش ہو گیا۔ آنیہ نے بھی بحث مناسب نہیں سمجھی۔ اسے خدشہ تھا کہ اسے پھر کھانسی شروع ہو جائے گی۔ وہ اس کے ورم زدہ پاؤں کے ناخن کاٹتی رہی۔ اپنے کومل ہاتھوں سے اس کے پاؤں کو سہلاتی رہی۔ وہ چہرے پر عجیب کیفیت لیے چپ چاپ لیٹا رہا۔ اس نے آنکھیں مضبوطی سے بند کر رکھی تھیں۔ وہ جب بھی اسے یوں خاموش دیکھتی تھی، اس کے ذہن میں اس کے پہلے موبائل فون پر دیکھا ہوا وہ شعر یاد آ جاتا تھا جو اس نے اس کی تصویر کے نیچے لکھ رکھا تھا۔

خطا تو جب ہو کہ ہم حالِ دل کسی سے کہیں
کسی کو چاہتے رہنا کوئی خطا تو نہیں

اچانک تہ خانے میں اندھیرا چھا گیا۔ بجلی چلی گئی تھی۔ راسم نے بے تاب ہو کر کہا۔ ''آنیہ، آپ کہاں ہیں؟''

وہ اس کے پاؤں کی طرف سے اٹھ کر سرہانے کی طرف آ گئی۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ اس کے بالوں میں انگلیاں چلانے لگی۔ نہ جانے اسے کیوں لگا کہ وہ جس بات کو کئی دنوں سے کہنا چاہ رہی ہے اور جو اس کے

www.pakistanipoint.com

ہونٹوں تک آتے آتے رک جاتی ہے، اب کہی جاسکتی ہے۔

اس نے راسم کے ہاتھ کو اپنے کومل ہاتھ میں رکھا اور عجب کیفیت میں اسے اپنے رخسار تک لے گئی۔ اس کے ہاتھ کی پشت کو اپنے گداز رخسار پر دباتے ہوئے وہ مستحکم آواز میں بولی۔ ''راسم! میں چاہتی ہوں کہ آپ کا ہاتھ ہمیشہ میرے ہاتھ میں رہے۔ میں آپ سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔''

یوں لگا جیسے راسم کے ہاتھ پر بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ اس نے تیزی سے ہاتھ پیچھے کھینچا اور طیش سے بولا۔ ''آپ اپنے ہوش میں تو ہیں؟ کیا دیوانوں جیسی بات کر رہی ہیں۔ م...... مجھے آپ سے ایسی بے وقوفی کی توقع نہیں تھی۔''

''نہیں راسم، میں جو کچھ کہہ رہی ہوں، بہت سوچ سمجھ کر کہہ رہی ہوں۔ حالات جو بھی ہیں۔ جیسے بھی ہیں، میں آپ کی زندگی میں آنا چاہتی ہوں۔''

راسم غصے میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر پھر اسے شدید کھانسی ہونے لگی۔ آنیہ نے ہاتھ چلا کر ٹارچ ڈھونڈی اور اس کی روشنی میں راسم کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ سنبھل گیا مگر اس کے زخمی چہرے پر غصے اور جھلاہٹ کے تاثرات صاف نظر آرہے تھے۔ آنیہ کف سیرپ لانے کا بہانہ کرکے بیسمنٹ سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

چھ سات روز تہ خانے میں گزارنے کے بعد دلبر ماموں ایک بار پھر راسم اور آنیہ کو اوپر بڑے کمروں میں لے آئے۔ ان کا خیال تھا کہ اب خطرہ ٹل گیا ہے۔ بہرحال اتنی احتیاط انہوں نے ضرور کی تھی کہ اس مرتبہ انہیں کوٹھی کے دو عقبی کمرے دیے گئے تھے۔ راسم کی حالت کی وجہ سے آنیہ اس کے ساتھ ایک ہی کمرے میں سوتی تھی۔ وہ ایک ''صوفہ کم بیڈ'' استعمال کر رہی تھی۔ راسم کچھ کچھ ناراض تھا۔

ایک رات وہ اٹھ کر ساتھ والے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے پاپا سے ''واٹس ایپ'' پر رابطہ کیا۔ یہ وڈیو کال تھی۔ آنیہ نے سلسلۂ کلام وہیں سے شروع کیا جہاں سے پچھلی رات چھوڑا تھا۔ آج اس نے پاپا کے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے۔ اس کی جھولی میں آنسو بارش کے قطروں کی طرح گر رہے تھے۔ ''پاپا! آپ نے مجھے سچ بولنا سکھایا...... اور سچ یہی ہے کہ میں راسم سے محبت کرتی ہوں۔ آپ کو پتا ہے کہ آپ کی بیٹی کبھی کوئی جذباتی فیصلہ نہیں کرسکتی۔ یہ فیصلہ بھی بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے میں نے۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں پاپا! اگر راسم میری زندگی میں نہ آسکے تو پھر کوئی نہیں آئے گا۔ میں آپ ہی کے سر کی قسم کھا کر کہتی ہوں، کوئی نہیں آئے گا۔'' وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔

خورشید عالم خاموش تھے۔ اُن کے چہرے پر لکیروں کا جال بچھا ہوا تھا۔ وہ جانتے تھے، ان کی بیٹی ہمیشہ سے انوکھی راہوں پر چلتی رہی ہے مگر وہ جتنی انوکھی اور جدا تھی، اتنی ہی گہری بھی تھی۔ اس کے فیصلے آسانی سے بدلتے نہیں تھے۔

وہ ایک بار پھر سسکنے لگی۔ ''پاپا! اس بات کا امکان بھی موجود ہے کہ میں انہیں ان کے ارادوں سے باز رکھنے میں کامیاب ہو جاؤں اور...... آپ کے تو تعلقات ہیں، SOURCES ہیں، آپ ہمیں باہر بھجوا دیجیے گا۔ ہم ان سارے بکھیڑوں سے نکل کر کہیں دور بھی تو جاسکتے ہیں۔''

کچھ دیر خاموشی رہی پھر وہ گرجے۔ ''آنیہ! بچہ نہیں ہوں میں۔ لولی پاپ دکھا دکھا کر مجھے بہلانے کی کوشش مت کرو۔ میں تمہارے لیے اپنے دل میں موجود تمام تر محبت اور رعایت کو بروئے کار لاکر سوچوں تو بھی تمہاری اس سنگین حماقت کا ساتھ نہیں دے سکتا۔''

''پاپا! وہ کوئی مجرم نہیں ہے۔ وہ اُن لوگوں میں سے ہے جو ظلم کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ ہزاروں، لاکھوں کشمیریوں کی آواز بنے ہوئے ہیں......''

''شٹ اَپ...... شٹ اَپ۔'' وہ پھر دہاڑے۔ ''مجھے پولیٹیکل سائنس مت پڑھاؤ۔''

اس نے روتے روتے کسی ننھی بچی کی طرح پھر ہاتھ جوڑ دیے۔ ''سوری پاپا...... سوری...... مگر میں کیا کروں؟''

''ڈوب مرو۔ دفع ہو جاؤ جہاں جانا چاہتی ہو۔ ہم سمجھیں گے کہ مرگئی ہو...... مرگئی ہو۔'' انہوں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

سلسلہ منقطع ہوگیا مگر وہ اسی طرح ہاتھ جوڑے بیٹھی رہی۔ روتی رہی...... اور روتی رہی۔ رات کا باقی حصہ اس نے جاگتے ہوئے ہی گزارا۔ وہ ماہی بے آب تھی جس نے کبھی کچھ نہ کہا ہو اس کا تو مارا ہوا پھول بھی پتھر لگتا ہے۔ یہ شاید اس کی زندگی کی کربناک ترین رات تھی۔ اگلی صبح وہ اپنے فون پر ایک ٹیکسٹ میسج دیکھ کر حیران رہ گئی۔ یہ میسج ابھی صبح سویرے اس کے پاپا کی طرف سے آیا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا ''کال می۔'' آنیہ نے کانپتے ہاتھوں اور دھڑکتے دل کے ساتھ انہیں واٹس ایپ پر کال کی۔ پاپا کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں مگر ان کے چہرے پر آنیہ کی محبت ایک پھوار کی طرح برس رہی تھی۔ یہ ایک غیر متوقع منظر تھا۔ وہ اس کی طرف گہری نظروں سے دیکھ کر بدلے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''اب یہ رونا دھونا بند کرو...... ٹھیک ہے...... تم جیسا

www.pakistanipoint.com

کہہ رہی ہو، ویسا ہی ہوگا۔''

اسے اپنی سماعت پر بھروسا نہیں ہوا۔ انہوں نے کہا تھا، رونا دھونا بند کرو، وہ ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس نے اپنی پیشانی موبائل کی اسکرین پر رکھ دی تھی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ پاپا کی گود میں سر رکھ رہی ہے۔

☆☆☆

واقعات میں یکا یک تیزی آ گئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ ہر کام جلدی جلدی اور ڈرامائی انداز میں ہو رہا ہے۔ شکر کا مقام تھا۔ شہابی کی طرف سے مزید کسی خدشے نے حقیقت کا روپ نہیں دھارا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کی عداوت، فرحان کی عداوت سے کم ہی رہی ہے۔ وہ ایک ڈنک مارنے کے بعد اس سارے معاملے سے الگ تھلگ ہو گیا تھا جس روز راسم نے از خود منہ ہاتھ دھویا اور پاؤں پر آہستہ آہستہ وزن ڈالتا ہوا کھڑکی کی طرف گیا، آنیہ بھی کندھے سے کندھا ملا کر اس کے ساتھ جا کھڑی ہوئی۔ شام سفیدے اور چیڑ کے درختوں پر اتر رہی تھی۔ اس کے پس منظر میں چوٹیاں تھیں اور چنار کے پیڑ تھے...... اور ان سے آگے...... کافی آگے، سرینگر تھا...... وہ نظر نہیں آ رہا تھا مگر وہاں جو شعلے بھڑک رہے تھے، ان کی حدت محسوس کی جا سکتی تھی۔ سامنے سے گزرنے والی اندرونی سڑک پر کسی فوجی گاڑی کی موجودگی کا اندازہ ہوتا تھا۔ ایسی گاڑیاں ہر گلی کوچے میں نظر آتی تھیں۔ ''آٹھ نو لاکھ'' کی نفری کچھ کم تو نہیں ہوتی۔

آنیہ نے کہا۔ ''پھر آپ نے کیا سوچا؟''

''کس بارے میں؟''

''آپ جانتے ہیں، کس بارے میں۔''

راسم کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اپنے طیش کو دباتے ہوئے بولا۔ ''آنیہ! آپ سراب کے پیچھے بھاگ رہی ہیں۔ کیا آپ ایک لاش سے شادی کرنا چاہتی ہیں؟''

''ایک زندہ انسان سے کرنا چاہتی ہوں لیکن وہ شاید، مجھے لاش میں تبدیل کرنا چاہتا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''اگر آپ کا یہ جواب حتمی ہے تو پھر...... مجھے بھی زندہ رہنے کی زیادہ خواہش نہیں ہے۔ میں جلدی مرنا چاہوں گی۔'' اس نے آخری الفاظ انگلش میں کہے تھے۔

''اپنی جان لینے کی دھمکی دے رہی ہیں؟''

''مسلمان ہوں۔ حرام موت کیوں مروں گی۔ مجھے کوئی ہتھیار دے دیں۔ ان انسان نما درندوں میں سے دو چار کو مار کر خود بھی مٹی اوڑھ لوں گی بلکہ اگر آپ کا جواب حتمی ہے تو یہ کام میں ابھی کر سکتی ہوں۔''

''آپ فضول بکواس کر رہی ہیں۔ میں ایسے فلمی مکالموں سے متاثر ہونے والا نہیں ہوں۔'' اس نے بیزاری سے کہا اور صوفے پر آن بیٹھا۔

وہ کچھ دیر تک عجیب نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر الماری کی طرف گئی۔ وہ جانتی تھی...... ماموں دلبر نے حفاظت کے خیال سے راسم کو ایک کولٹ پسٹل دے رکھا ہے۔ اس نے تہ در تہ رکھے کمبلوں اور چادروں کے نیچے سے وہ بھرا ہوا پسٹل نکال لیا۔ راسم کا پارا بھی ایک دم چڑھ گیا۔ وہ کراہ کر بولا۔ ''ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے ابھی جاؤ۔ اسی وقت جاؤ۔ مار دو، دو چار کو اور خود بھی سکون پالو تم۔'' وہ پہلی بار اسے آپ کے بجائے ''تم'' کہہ رہا تھا۔

وہ اٹھا اور دوسرے کمرے میں جا کر دروازہ دھڑام سے بند کر لیا۔ وہ آنیہ سے اس لہجے میں بولنا نہیں چاہتا تھا مگر وہ جو کچھ کہتی تھی اسے سن کر اس کا دم گھٹنے لگتا تھا۔ یکا یک اس کی نگاہ کھڑکی سے گزر کر کوٹھی کے گراسی لان کی طرف اٹھ گئی۔ وہ بھونچکا رہ گیا۔ آنیہ نے ایک چادر لپیٹ رکھی تھی اور سیدھی مین گیٹ کی طرف جا رہی تھی۔ دلبر سنگھ غالباً سو رہے تھے۔ خیرو کچن میں مصروف تھا۔ وہ کسی بھی لمحے گیٹ کے پار پہنچ سکتی تھی اور سڑک پر یقیناً کم از کم ایک فوجی گاڑی تو ضرور موجود تھی، کیا وہ ہوش کھو بیٹھی تھی؟ وہ اپنے پاؤں کی شدید تکلیف کو فراموش کر گیا۔ دروازہ کھول کر اس کے پیچھے لپکا۔ وہ ابھی گیٹ سے آٹھ دس قدم دور تھی جب وہ پکارا۔ ''آنیہ...... رک جاؤ۔''

وہ پلٹی اور راسم کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ کانپتے جسم کے ساتھ اس کے قریب پہنچا۔ آنیہ کے گال پر اس کا طمانچہ بڑا زوردار تھا۔ آواز دور تک گئی پھر دوسرا اور پھر تیسرا۔ وہ لڑکھڑا کر ''ڈرائیو وے'' پر گر گئی۔ پستول اس کی چادر سے نکل کر گھاس پر لڑھک گیا۔ خیرو اندر سے بھاگتا ہوا آیا۔ راسم نے پستول اٹھا کر شرٹ کے نیچے لگایا۔ اسی دوران میں دلبر صاحب بھی اپنے بھاری جسم کو جھلاتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ وہ ہکا بکا تھے۔ راسم نے دلبر سنگھ جی کو دیکھا تو آنیہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''سنبھال لیجیے اِسے، اس کے حواس ٹھکانے نہیں ہیں۔'' پھر وہ لنگڑاتا ہوا اندر چلا گیا۔

رات کو جب وہ کھڑکی کے قریب خاموش کھڑا تھا، وہ کھانے کی ٹرے لیے ہوئے اندر آئی۔ اس کا ایک گال سوجا ہوا تھا۔ نچلے ہونٹ پر زخم تھا۔ اس نے جھک کر ٹرے میز پر رکھ دی۔ اسی روزمرہ کے لہجے میں بولی۔ ''دوا کا وقت ہو

www.pakistanipoint.com

جائے گا۔ کھانا کھا لیجیے۔''

وہ گم صم اس کی طرف دیکھتا رہا، جیسے سوچ رہا ہو، کیا چیز ہے یہ لڑکی؟ پھر گمبھیر آواز میں بولا۔ ''اِدھر آؤ میرے پاس۔''

وہ اس کے قریب آن کھڑی ہوئی۔ وہ عجیب کیفیت میں اسے دیکھتا رہا۔ ''اور مارنے کو دل چاہ رہا ہے؟'' اس نے ایک دل گداز سادگی کے ساتھ پوچھا۔

راسم کا دل رو دیا۔ اس نے جیسے تڑپ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ اس کے بالوں، پیشانی اور رخساروں پر بوسے دینے لگا۔ پھر وہ بھی سسک پڑی۔ اس کے کشادہ سینے میں جذب سی ہوگئی۔ وہ کراہا۔ ''مجھے معاف کردو آنیہ! مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا...... ہرگز نہیں۔''

''آپ کر سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ کر سکتے ہیں۔ میری جان لے سکتے ہیں۔'' وہ روح کی گہرائی سے بولی۔

''آنیہ میں کیا کروں؟ تم نے مجھے ایک امتحان میں ڈال دیا ہے۔'' وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔

☆☆☆

اس کے بعد جو کچھ ہوا، بڑی سرعت سے ہوا۔ آنیہ کے سامنے کسی کی پیش نہیں چلی تھی۔ چل ہی نہیں سکی تھی۔ ایک دن آنیہ کے پاپا (بیرسٹر خورشید عالم) نے فون پر اس سے پوچھا کہ کیا ان کا یہ شک درست ہے کہ وہ دلبر سنگھ جی کے پاس ہی رہ رہی ہے؟ وہ پاپا سے جھوٹ نہیں بول سکتی تھی اور اس نے نہیں بولا۔ اس سے آگے نہ پاپا نے پوچھا نہ اس نے بتایا اور یہ رازداری ایک لحاظ سے ٹھیک ہی تھی۔ پاپا کو صرف اتنا پتا تھا کہ وہ راجوری ڈسٹرکٹ میں کہیں ہے۔ پاپا نے براہِ راست دلبر سنگھ جی سے بات کی۔ دونوں میں دیر تک جذباتی گفتگو ہوئی۔ آخر آنیہ کے پاپا نے حلفیہ طور پر ماموں دلبر سنگھ کو آنیہ کا سرپرست قرار دیا اور انہیں اجازت دی کہ وہ اس کا نکاح اس کی مرضی کے مطابق کردیں۔ نکاح کے لیے آٹھ دن بعد کی تاریخ بھی انہوں نے خود ہی مقرر کی۔

راجوری سمیت کشمیر کے حالات روز بروز بگڑتے جا رہے تھے۔ مودی کی مسلم کش پالیسیوں نے ایک ہیجان سا برپا کردیا تھا۔ راجوری حالانکہ سرینگر سے فاصلے پر تھا پھر بھی یہاں دن رات سڑکوں پر انڈین فوجی دندنانے لگے تھے۔ وہ راتوں کو گھروں میں گھستے، خواتین کو ہراساں کرتے۔ نوجوان لڑکوں کے موبائل اور شناختی کارڈز زبردستی لے جاتے اور انہیں حکم ملتا کہ وہ ایک یا دو روز بعد قریبی فوجی کیمپ میں رپورٹ کریں۔ علاقے میں راسم کی تلاش بھی زور و شور سے جاری تھی۔ خیرو کا کہنا تھا کہ اس علاقے (باغ) کی تقریباً ہر دیوار پر راسم صاحب کی تصویر نظر آتی ہے۔

یوں لگتا تھا کہ کسی بھی وقت کچھ ہو جائے گا۔ جو ڈاکٹر صاحب راسم کو دیکھنے آتے تھے، انہوں نے ہی ایک نہایت قابلِ بھروسا نکاح خواں کا انتظام بھی کردیا تھا۔ آنیہ کے سرپرست کا کردار، دلبر سنگھ جی نے خیرو کو سونپ دیا تھا۔ خیرو گھر کا ملازم نہیں فرد ہی سمجھا جاتا تھا۔ خیرو کا داماد امیر حمزہ اور اس کا بھائی گواہ بنا لیے گئے۔ بالکل آخری وقت میں آنیہ کے پاپا اس کی ماما کو بھی فون پر لانے میں کامیاب ہوگئے۔ حسبِ اندیشہ کافی رونے دھونے کے بعد ماما نے آنیہ کو یہ تاکید کی کہ وہ اپنے ہونے والے شوہر کے سامنے کم از کم ایک شرط ضرور رکھے اور وہ یہ کہ یہ سارا گورکھ دھندا چھوڑ کر اس کے ساتھ بیرونِ ملک جانے کو تیار ہو جائے گا۔ آنیہ بس ''ہوں، ہاں'' میں جواب دیتی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ ہوا کو مٹھی میں بند نہیں کیا جاسکتا جو کچھ راسم کے سینے میں بھڑکتا رہتا تھا، وہ اس سے آگاہ تھی۔ چند منٹ بعد ہی اس کی ماما وڈیو کال سے اٹھ کر چلی گئیں۔

اب دلبر ماموں بھی چاہتے تھے کہ یہ نکاح جلد سے جلد ہو جائے۔ وہ اس وادیٔ کشمیر کی ایک نسبتاً پرسکون اور گلابی شام تھی، جب تین بار ''قبول ہے'' کہا گیا اور دو پیار کرنے والے ایک ہوئے۔ آنیہ خورشید بڑی سادگی کے ساتھ آنیہ راسم بن گئی۔ نکاح نامے میں راسم کا نام راسم حفیظ لکھا گیا تھا مگر وہاں موجود لوگوں میں صرف وہ جانتی تھی کہ وہ راسم حفیظ نہیں راسم تیمور ہے۔ اس کا نسب کہیں اور جا کر ملتا ہے۔

وہ تھوڑے دن تھے لیکن بڑے خوب صورت تھے۔ کسی حسین سپنے جیسے۔ وہ آنیہ کو چاہتا تھا مگر اس کے پیار سے انکار کرتا تھا۔ اب اس نے اقرار کیا تھا تو اقرار کا حق ادا کر دیا تھا۔ چاہا تھا تو اس طرح ٹوٹ کر چاہا تھا کہ وہ دم بخود رہ گئی تھی۔ وہ یک جان دو قالب ہوگئے تھے اور یہ کوئی عارضی کیفیت نہیں تھی۔ اس میں جو گہرائی تھی اس کی شدت کو وہ دونوں ہی محسوس کرسکتے تھے۔

آدھی شب کا وقت تھا۔ راجوری کی پہاڑیوں پر رم جھم ہو رہی تھی۔ آنیہ، راسم کے سینے پر سر رکھے، آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔ وہ کھوئے ہوئے سے لہجے میں بولا۔ ''کچھ

www.pakistanipoint.com

عرصہ پہلے دیکھی ہوئی ایک نیوز یاد آجاتی ہے۔ بیرونِ ملک تم جیسی کسی دیوانی لڑکی نے پھانسی کے ایک مجرم سے شادی کی تھی۔ یہ شادی اس کے ''ڈیتھ سیل'' میں ہوئی تھی۔''

اب وہ دونوں ایک دوسرے کو بے تکلفی سے تم کہہ کے مخاطب کرتے تھے۔ آنیہ نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔ ''راسم! تم خود ہی تو کہتے ہو، جو پل ہم گزار رہے ہیں وہی ہمارا ہے۔ نہ جانے والے پل پر ہمارا اختیار ہے نہ آنے والے پر۔''

''آنیہ! میں اب ٹھیک ہو چکا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ اب میرے جانے کا وقت قریب آرہا ہے۔''

''میں جانتی ہوں۔'' وہ عجب گمشدہ آواز میں بولی۔

''تو پھر؟'' اس نے پوچھا۔

ہوا نے چنار اور چیڑ کے اونچے پیڑوں میں سسکی سی بھری۔ آسمان سے پھر موتی برسنے لگے وہ اس کے سینے کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے بولی۔ ''کم از کم میری ایک بات تو مانو راسم...... مجھے...... اکیلا چھوڑ کر نہ جاؤ۔''

وہ اس کی بات کا مفہوم سمجھ رہا تھا۔ اس کے ریشمی رخساروں کو سہلاتے ہوئے کہنے لگا۔ ''مجھے کیا پتا، یہ ''آنے والا'' کب آئے گا...... اور بیٹا ہوگا یا بیٹی؟''

وہ اُس کے سینے میں منہ چھپا کر نم و شرگیں لہجے میں بولی۔ ''جو بھی ہوگا، تمہارا ہوگا...... اور میرا ہوگا۔ میں بس یہی چاہتی ہوں۔'' آنسو راسم کے سینے کو بھگو رہے تھے۔

''آنیہ! مجھے کمزور مت کرنا پلیز۔''

''نہیں کروں گی، کبھی نہیں کروں گی۔ جو کہنا تھا، کہہ چکی۔ اب مزید کچھ نہیں کہوں گی۔ اپنے وعدے پر قائم رہوں گی۔'' وہ اس کے اندر جذب ہوتے ہوئے بولی۔

اس نے اسے اپنی مضبوط، مہرباں بانہوں کے حصار میں لے لیا۔ دونوں ایک ریشمی اندھیرے میں گم ہو گئے...... کھڑکیوں سے باہر بجلی چمک رہی تھی، بادل گرج رہے تھے۔ دور کہیں پہاڑوں میں کسی وقت کوئی فائر ہوتا تھا اور اس کی آواز ہوا کے دوش پر تیر کر در و دیوار سے ٹکراتی تھی۔

...... دن گزر رہے تھے...... آنیہ کو لگتا تھا کہ ہر گزرنے والے دن کے ساتھ ایک وعدہ راسم کو پکار رہا ہے۔ ایک آواز ان دونوں کی جدائی کا اعلان کر رہی ہے۔ خوشی کے پھول کے ساتھ یہ درد کا ایک بے رحم کانٹا تھا جو ہر وقت اپنی موجودگی کا احساس دلاتا تھا۔ راسم کے بیشتر زخم ٹھیک ہو چکے تھے۔ صرف انگلیوں پر بینڈیج موجود تھی۔

اس نے کئی مہینوں سے شیو نہیں کی تھی۔ اب اس کی باقاعدہ، سیاہ چمکیلی داڑھی تھی۔ مونچھیں کافی بڑی اور گھنی ہو چکی تھیں۔ ایک دن آنیہ پر انکشاف ہوا کہ وہ مونچھ داڑھی کیوں بڑھا رہا ہے۔ وہ نہا کر باتھ روم سے باہر نکلی تو اس نے اپنے بیڈ پر، نیلی پگڑی والے ایک سکھ نوجوان کو بیٹھے دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ چلّا اٹھتی، اسے پتا چلا کہ وہ کوئی اور نہیں خود راسم ہے۔ لباس اور پگڑی وغیرہ نے اس کا حلیہ حیران کن طور پر تبدیل کر دیا تھا۔

اسی دن شام کو وہ شاید اپنے آپ کو چیک کرنے کے لیے ہی موٹر بائیک پر سوار ہو کر کوٹھی سے باہر چلا گیا (یہ موٹر بائیک اس کوٹھی کے اندر سے ہی اسے ملی تھی) وہ جب تک واپس نہیں آیا، آنیہ کا دل اس کے سینے میں بے کل پرندے کی طرح پھڑپھڑاتا رہا۔ وہ واپس آیا تو اس کے کندھوں پر ایک براؤن گرم چادر تھی۔ کافی خوش دکھائی دے رہا تھا۔ ''راسم! تم نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔ ایسے باہر کیوں چلے گئے؟''

''بڑا فائدہ ہوا ہے۔ چلو اندر آؤ تمہیں بتاتا ہوں۔'' وہ بولا۔ اس کے ہاتھ میں گتے کا ایک چھوٹا باکس بھی تھا۔ شاید کھانے کی کوئی چیز تھی۔ ''پتا ہے کہاں سے آرہا ہوں؟'' اس نے کہا۔ ''زباب منزل سے۔ شہابی کی امی جان زباب خالہ سے مل کر آیا ہوں۔ شہابی کی امی جان کو زباب خالہ ہی کہتا ہوں۔''

''او گاڈ! زباب منزل چلے گئے تھے؟'' وہ ازحد حیران ہوئی۔

جواب میں راسم نے جو کچھ بتایا، وہ مختصراً یوں تھا......

آج مہینے کا پہلا جمعہ تھا۔ زباب بیگم اس موقع پر زباب منزل سے باہر آتی تھیں اور ایک شامیانے میں موجود لوگوں میں خیر خیرات تقسیم کرتی تھیں۔ وہ ان لوگوں میں شامل ہو گیا تھا اور دور سے کھڑا انہیں دیکھتا رہا تھا پھر اس نے مزید ہمت کی تھی اور خیرات لینے والوں کی قطار میں لگ گیا تھا۔ اسے خوشی تھی کہ کوئی اسے پہچان نہیں سکا۔ اپنی باری پر اسے بریانی والا باکس ملا اور چادر کا یہ پیکٹ ملا۔ پیکٹ اس نے جان بوجھ کر گرایا اور پیکٹ اٹھاتے ہوئے زباب بیگم کے پاؤں کو چھوا۔ وہ ان کی بے حد عزت کرتا تھا۔

آنیہ نے پوچھا۔ ''اپنی والدہ (آپا خالہ) سے نہیں ملے؟''

''نہیں، وہ اندر تھیں۔ اُن سے ملنا مشکل تھا۔'' وہ عام سے لہجے میں بولا۔

www.pakistanipoint.com

آنیہ اسے گہری نظروں سے دیکھ کر رہ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ پس پردہ کیا ماجرا ہے۔ اسے ہمیشہ سے زباب بیگم سے انسیت تھی۔ شاید اپنی ماں (آپا خالہ) سے بھی زیادہ وہ ان کے قریب تھا۔ اب تو اس پر یہ عقدہ بھی کھل چکا تھا کہ وہی اس کی اصل ماں ہیں۔ وہ اپنی زندگی کو ایک ٹمٹماتے چراغ کی طرح سمجھتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اب وہ انہیں حقیقت بتا کر جدائی کا صدمہ دینا نہیں چاہتا تھا۔ کسی وقت آنیہ کو لگتا تھا کہ وہ ہر چیز کو بیگانی سی نظر سے دیکھتا ہے۔ جیسے کوئی مسافر کسی نئی منزل کی طرف گامزن ہو اور سامان باندھے، پلیٹ فارم پر بیٹھا ہو۔ غالباً یہی سبب تھا کہ بیتے ہوئے دنوں میں وہ ماں کو ماں نہیں کہہ سکا تھا اور پھر آنیہ کو 'اپنی محبت' کہنے سے کترا تا رہا تھا۔

اس نے گتے کا باکس کھولا۔ اس میں خوشبودار بریانی تھی اور بریانی کے اوپر پانچ چھ سیخ کباب رکھے تھے۔ ''یہ کباب بھی اسی بریانی میں تھے؟'' آنیہ نے پوچھا۔

''نہیں، یہ گڈلک ریستوران سے لیے ہیں۔ بندہ راجوری آئے اور گڈلک ریستوران کے سیخ کباب، وہی کے رائتے کے ساتھ نہ کھائے تو یہ بڑے ظلم کی بات ہے۔''

اس نے بتایا۔ ''ریستوران کے مالک عمر رسیدہ، مگر خوش باش میاں بیوی ہیں۔ میاں کی عمر قریباً نوے برس اور بیوی کی پچاسی برس ہوگی۔ اب یہ یہاں کی ایک روایت بن گئی ہے کہ نوجوان شادی شادہ جوڑے اپنی شادی کی سالگرہ پر ریستوران میں جاتے ہیں۔ کباب آرڈر کرتے ہیں اور واپسی کے وقت عمر رسیدہ جوڑے کے ساتھ تصویر اترواتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ چلو......'' وہ کہتے کہتے ایک دم رک گیا۔

ماحول کے شیشے پر چوٹ سی پڑی۔ آنیہ کے سینے میں جیسے کچھ ٹوٹ کر بکھر گیا۔ وہ راسم کا فقرہ مکمل کرتے ہوئے بولی۔ ''آپ نے سوچا کہ ہم دونوں تو شاید کبھی اس ریستوران میں نہ جاسکیں، چلو یہ کباب ہی سہی۔''

دونوں کا دل جیسے ایک دم بھر گیا تھا۔ کبابوں کی مہک، بریانی کی خوشبو، کھڑکی سے جھانکتا ہوا چاند، کچھ بھی اچھا نہیں لگا۔ وہ دونوں بُت سے بنے وہاں بیٹھے رہے۔ آنیہ کی آنکھوں میں کاجل پھیلنے لگا۔ اس نے ڈبا بند کر کے فریج میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''چلیں، کل کھالیں گے۔''

اگلے چھ سات روز بھی اسی طرح گزرے۔ دکھ کے پانیوں میں راحت کے چند چھوٹے چھوٹے جزیرے بھی آئے۔ آنیہ کے بہت منع کرنے کے باوجود راسم اپنے اس پگڑی اور داڑھی مونچھ والے بھیس میں دو بار گھر سے باہر بھی گیا۔ بے شک آنیہ دلی طور پر اس کی ''بے خوفی'' کی پرستار تھی مگر فی الوقت اسے یہ بے خوفی...... بے پروائی کے زمرے میں محسوس ہوتی تھی اور اسے اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ دلبر ماموں نے بھی اسے اس حوالے سے محتاط رہنے کا کہا تھا۔ کبھی کبھی آنیہ کو لسانیات کے ماہر، پروفیسر زیڈ اے صدیقی کی کہی ہوئی ایک بات بھی یاد آتی تھی۔ انہوں نے کہا تھا۔ کشمیر میں فریڈم فائٹنگ ایک ایسا شعبہ ہے جہاں ہمیشہ شہادت کی بہت سی ''ویکیسیاں'' ہوتی ہیں۔ امیدواروں کو مایوسی نہیں ہوتی۔ اپلائی کرنے کے بعد زیادہ سے زیادہ ایک ڈیڑھ سال کے اندر ان کی مراد پوری ہو جاتی ہے۔ یہ سب یاد آتے ہی آنیہ کا دل ڈوبنے لگتا تھا......

ایک روز آنیہ جب کچن میں اس کے لیے اس کی پسندیدہ، مکئی کی میٹھی روٹی بنا رہی تھی، اسے لگا کہ وہ کمرے میں فون پر کسی سے بات کر رہا ہے۔ وہ ہر وقت اس کی طرف سے متفکر رہتی تھی۔ اس نے دروازے سے کان لگا کر سنا لیکن مایوسی ہوئی۔ وہ شاید کشمیری میں بات کر رہا تھا مگر پھر اس پر انکشاف ہوا کہ یہ کشمیری بھی نہیں ہے۔ یہ وہی ''جناتی'' زبان تھی جس میں اس کی ڈائری لکھی گئی تھی۔

اس روز ناشتے کے بعد دونوں میں دیر تک بحث ہوئی اور آنیہ نے کسی نہ کسی طرح اس سے عارضی طور پر وہ کولٹ پسٹل لے لیا جو اسے ہر وقت اضطراب میں مبتلا رکھتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ کسی دن راسم یہ پستول لے کر نکل جائے گا اور کچھ کر بیٹھے گا۔ سہ پہر کے وقت وہ سو رہا تھا۔ آنیہ نے وہ پستول چھپا دیا۔ اس کے لیے اس نے ویلوٹ کا ایک براؤن لحاف ایک کونے سے ادھیڑا اور بڑی صفائی سے پستول اس کی روئی میں گھسیڑ دیا۔ یہ لحاف استعمال نہیں ہوتا تھا۔ آنیہ کی ذہنی کیفیت ان دنوں عجیب ہوگئی تھی۔ اسے ہر وقت راسم کی طرف سے دھڑکا لگا رہتا تھا۔

تب ایک روز جب وہ دونوں خوشگوار موڈ میں بیٹھے تھے، راسم نے اسے بتایا۔ ''کل ایک دوست صبح چار بجے والی فلائٹ سے راجوری آرہا ہے۔ اس سے ملنا اشد ضروری ہے۔ صبح چار بجے کے قریب نکلوں گا اور بس اسے ریسیو کر کے آجاؤں گا۔''

''وہ بھی ساتھ آئے گا؟'' آنیہ نے پوچھا۔

راسم نے نفی میں جواب دیا اور بتایا کہ صرف ریسیو کرنا ہے۔ آنیہ پھر ڈپریشن میں چلی گئی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے اسے قائل اور مطمئن کیا، بولا۔ ''صبح سویرے

www.pakistanipoint.com

نکلنا ہے اس لیے تمہیں جگاؤں گا نہیں؟''

وہ صبح تین بجے اٹھا تھا، اس نے آنیہ کو سویا ہوا سمجھا تھا اور اس کی پیشانی پر بوسہ دے کر چلا گیا تھا اور تب ہی آنیہ لپک کر ویلوٹ کے لحاف تک پہنچی تھی۔ وہ کٹا پھٹا ہوا تھا۔ اس میں پستول موجود نہیں تھا۔

آنیہ کا طویل فلیش بیک ختم ہوا۔ وہیں بستر پر بیٹھے بیٹھے، ماضی کے دریچے میں جھانکتے ہوئے، آنیہ نے قریباً دو گھنٹے گزار دیے تھے۔ کئی ماہ کے مناظر ترتیب وار اس کی نگاہ کے سامنے سے گزرے تھے اور وہیں آ کر رک گئے تھے جہاں سے آغاز ہوا تھا ......وہ ڈبل بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ کھڑکی سے باہر سفیدے کے پیڑ خاموش کھڑے تھے۔ ادھ کھلی الماری میں سے وہ لحاف بھی جھانک رہا تھا۔ جسے راسم نے پھاڑا تھا اور اس میں چھپایا گیا پسٹل نکال کر لے گیا تھا۔ سامنے کھڑکی کی چوکھٹ پر اسٹیکر چسپاں تھا۔ ''ہم نہیں مانتے ظلم کے ضابطے'' اوپر ایک ٹوٹی ہوئی زنجیر کا عکس تھا اور نیچے انگوٹھے کا وہ نشان تھا جو سیاہی سے نہیں خون سے لگایا گیا تھا۔

وہ طویل سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ رات کے اندھیرے میں اجالے کی سیندھ لگنے لگی تھی۔ وہ کھڑکی کی طرف بڑھی تو پاؤں کی ایک ایڑی میں سخت درد محسوس ہوا۔ یہ چوٹ اس دھکے کی نشانی تھی جو راسم نے اسے موٹر بائیک سے دور ہٹاتے وقت دیا تھا اور پھر اندھیرے میں اوجھل ہو گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ اروڑا کی طرف نہیں جا رہا، ابھی وہ کسی اور کام سے جا رہا ہے مگر آنیہ کے دل کی گواہی تھی کہ فی الوقت اروڑا کے سوا اس کے ذہن میں کچھ اور ہے ہی نہیں۔ اروڑا بہت بڑا شخص تھا، اس کی پہنچ سے بہت دور تھا مگر وہ اب بھی اس تک پہنچنے کی اپنی سی کوشش کرنا چاہتا تھا اور وہ چلا گیا تھا۔

آنیہ کی آنکھوں میں آنسو جمع ہونے لگے۔ وہ دل ہی دل میں پکاری۔ ''راسم! تم نے تو مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ کم از کم اس وقت تک مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گے جب تک میرا ''اکیلا پن'' ختم نہ ہو جائے۔ اور تم ''آنے والے'' کا انتظار کیے بغیر ہی چلے گئے ہو۔'' اس نے اپنے ہاتھوں کی مہندی کی طرف دیکھا۔ اپنی ٹوٹی ہوئی ست رنگی چوڑیوں پر نگاہ دوڑائی۔ ''راسم! ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ ابھی تو میری ہتھیلی میں حنا کی خوشبو بھی ماند نہیں پڑی۔''

دلبر ماموں کے کھنکھارنے کی آواز آئی اور آنیہ نے جلدی سے آنسو پونچھے۔ وہ اندر چلے آئے۔ ''دھی رانی!

موٹر سائیکل کہاں ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''ماموں! رات کو راسم لے کر گئے ہیں۔ کوئی ضروری کام تھا ان کو۔ کہتے تھے شام تک آ جاؤں گا......اور ہو سکتا ہے کہ صبح ہی آ جاؤں۔''

''اوہو، یہ منڈا بھی نا......'' انہوں نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ''اسے پتا بھی ہے کہ تھاں تھاں، دیواروں پر اس کے پوسٹر لگے ہوئے ہیں۔'' انہوں نے موبائل فون پر راسم کا نمبر پریس کیا۔ آنیہ جانتی تھی، اس کا نمبر بند ہوگا......اور وہ واقعی بند تھا۔

ناشتے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ بے قراری سے بند کمرے میں چکراتی رہی، اس کے خشک ہونٹوں پر دعائیں تھیں۔ ''یا اللہ! میرے سہاگ کی حفاظت فرما۔ یا اللہ اس کی مشکلیں آسان کر۔''

اسے کچھ پتا نہیں تھا، وہ کہاں گیا ہے۔ کیا کرنا چاہ رہا ہے۔ اس نے صبح واپس آ جانے کا کہا تھا۔ اب دس بجنے والے تھے۔ اس کی کوئی خبر نہیں تھی۔

لیکن پھر یوں ہوا کہ یکا یک خبروں کو پَر لگ گئے۔ نیوز چینلز چنگھاڑنے لگے، ہر طرف تہلکہ سا مچ گیا۔ اطلاع دی جا رہی تھی کہ وہ مارا گیا ہے...... ہاں، وہ مارا گیا تھا...... اروڑا مارا گیا تھا۔ اسے اس کے بیڈ روم میں تیز دھار آلے کے پے در پے وار کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ آنیہ اور دلبر سنگھ جی، بُت بنے ٹی وی کے سامنے بیٹھے تھے۔ نیوز کاسٹر چلا رہے تھے۔ فیلڈ رپورٹرز تازہ ترین اطلاعات دے رہے تھے۔ نامعلوم مسلح شخص ایک سکھ سیکیورٹی گارڈ کی وردی میں اروڑا کی رہائش گاہ میں جا گھسا تھا۔

ایک چینل پر نیوز ریڈر نے ہیجانی آہنگ میں کہا۔ ''اور یہ دیکھیے...... یہ سی سی ٹی وی فوٹیج ہمیں ابھی ابھی موصول ہوئی ہے۔ اس میں آپ صاف دیکھ سکتے ہیں کہ حملہ آور دو تھے۔ ایک پک اپ میں موجود تھا۔ دوسرے نے باؤنڈری وال کے قریب سے گارڈ کو چھاپا اور گھسیٹ کر پک اَپ میں لے گیا۔''

سی سی ٹی وی میں دکھایا جا رہا تھا۔ حملہ آور جس نے اپنا چہرہ پگڑی کے پلو میں چھپا رکھا تھا، بہت وحشت سے گارڈ.... پر جھپٹا۔ اسے گھما کر باؤنڈری وال کے ساتھ دے مارا۔ پھر اس کے بے ہوش جسم کو گھسیٹ کر سیاہ رنگ کی ہائی روف میں لے گیا۔

آنیہ کا دل پتے کی طرح لرزنے لگا۔ وہ حملہ آور کی

www.pakistanipoint.com

نیلی پگڑی، اور لباس دیکھ چکی تھی۔ اسّی نوّے فیصد امکان یہی تھا کہ وہ راسم ہے۔ اس کی سانس رکنے لگی۔ اس نے دلبر ماموں کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر بھی ہیجان تھا۔ فوٹیج میں اوپر کی طرف کلاک چل رہا تھا۔ سیکنڈ تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔ منظر کٹ ہوا۔ قریباً پانچ منٹ کے وقفے سے جو دوسرا منظر فوٹیج میں ابھرا، وہ سیاہ پک اَپ (ہائی روف) کا تھا جو رینگ کر باؤنڈری وال کے قریب پہنچی تھی پھر اس کی چھت پر ایک ہیولا نظر آیا۔

نیوز ریڈر بلند آواز میں بولا۔ ''اور یہ دیکھیں ناظرین...... غور سے دیکھنے پر پتا چلتا ہے کہ حملہ آور اب سیکیورٹی گارڈ کی وردی میں ہے اور پک اَپ کی چھت پر چڑھا ہوا ہے۔ اور یہ دیکھیں...... کتنی دیدہ دلیری ہے...... وہ چھت سے باؤنڈری وال پر چڑھ کر اندر کود رہا ہے۔'' نیم تاریکی میں ایک سرخ دائرہ حملہ آور کی نشاندہی کر رہا تھا۔

دلبر ماموں کے ہاتھ میں ریموٹ کنٹرول تھا۔ وہ مختلف چینلز بدلتے رہے تھے۔ ایک چینل پر اس منظر کی فوٹیج تھی جس میں حملہ آور اپنا کام مکمل کر کے اروڑا کی رہائش گاہ سے باہر نکل رہا تھا۔ کلاک سے پتا چل رہا تھا کہ یہ واردات صرف پانچ چھ منٹ میں مکمل ہوگئی ہے۔ کوٹھی کے اندر سے تین چار فائر سنائی دیے۔ پھر ایک ہیولا سا باؤنڈری وال پر نظر آیا اور باہر کود گیا۔ آگے کے مناظر اتنے واضح نہیں تھے کیونکہ ''ہائی روف'' اب اندھیرے میں تھی۔

''آخر اس نے مار دیا۔'' دلبر ماموں سنسنی خیز آواز میں بولے۔ ''یہ وہی ہے...... وہی ہے۔'' پھر وہ بے قرار ہو کر اٹھے۔ ''دھی رانی! یہ بہت بڑا واقعہ ہوگیا ہے۔ اس کا ری ایکشن بڑا سخت ہوگا۔ اب تمہارا اوپر رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ تم نیچے بیسمنٹ وچ چلی جاؤ۔ آؤ میرا پُتر۔''

آنیہ کے زرد رخساروں پر آنسو بہہ رہے تھے۔ سینے میں تلاطم تھا۔ دلبر ماموں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور لے کر بیسمنٹ کی طرف آگئے۔ نیوز کاسٹر کی آواز اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ ''ابھی ابھی تازہ سماچار آئی ہے کہ اس گھٹنا میں دو گارڈز کی موت ہوئی ہے اور ایک سخت گھائل ہے۔ فورسز نے پورے علاقے کو محاصرے میں لے لیا ہے۔''

دلبر سنگھ جی نے آنیہ کو بیسمنٹ میں بٹھایا، پھر لوہے کی الماری کا تالا کھولا اور اس کے اندر سے کپڑے میں لپٹی ہوئی کوئی چیز نکال لی۔ ایک نظر دیکھ کر ہی آنیہ کو اندازہ ہوگیا کہ یہ کوئی رائفل ہے۔ وہ آنیہ کا شانہ تھپک کر بولے۔ ''پریشان نہیں ہونا آنیہ پُتر! کوئی تم دونوں کا بال بھی بیکا نہیں کر سکدا۔''

تب وہ ایک بار پھر راسم کو فون ملانے کی ناکام کوشش کرنے لگے۔ آنیہ نے سوچا، اسی طرح کچھ عرصہ پہلے راسم نے ڈرے سہمے جوڑے ظہیر اور نادیہ کی مدد کی تھی، آج دلبر ماموں راسم اور اس کے سامنے ڈھال بنے ہوئے تھے۔

دلبر ماموں نے جہاں سے آٹومیٹک رائفل نکالی تھی وہاں ایک ٹیلی اسکوپ بھی پڑی ہوئی تھی۔ آنیہ اسے الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی پھر اسے دوبارہ الماری میں رکھ دیا۔ دلبر ماموں جا چکے تھے۔ اس نے وہاں موجود چھوٹا سا ٹی وی آن کر لیا۔ اب ''ری ویوز'' بھی آ رہے تھے۔ ایک تبصرہ نگار کہہ رہا تھا۔ ''بالکل...... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ اس گمبھیر گھٹنا میں بھی راسم عرف راسو کا رول ہو۔ یہ ہمارے اداروں کی ناکامی ہے کہ وہ ابھی تک مفرور ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اس کے کسی سکھ ساتھی کی کارروائی ہو......''

دوسرے تبصرے نگار نے قطع کلامی کی۔ ''دیکھیں، اب تو اس بات کے بھی واضح اشارے مل رہے ہیں کہ غالباً وہ خود ہی سکھ نوجوان کے بھیس میں تھا۔ ایک عینی شاہد کے مطابق حملہ آور نے وہاں جو نعرے لگائے ہیں، ان سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ مسلمان ہے اور اس نے اپنی شناخت چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی......''

پینل میں موجود ایک صحافی نے کہا۔ ''آکاش اروڑا صاحب کی ہتھیا جس بے رحمی سے کی گئی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہتھیارے کے اندر کتنی نفرت چھپی ہوئی تھی۔ اروڑا صاحب کے شریر پر چاقو کے کم از کم پندرہ گھاؤ موجود ہیں۔ ان کا سارا بیڈ خون سے لتھڑا ہوا تھا۔ کچھ اس طرح کی جانکاری بھی دی جا رہی ہے کہ شاید ان کی باڈی کو ''ڈیمج'' بھی کیا گیا ہے...... غالباً ایک بازو کو۔''

یکایک تہ خانے کی چھت سے ٹھکا ٹھک کی آوازیں آنا شروع ہوئیں۔ یہ بھاری بوٹوں کی آوازیں تھیں۔ تب فوجیوں کے بولنے اور دلبر ماموں کے گرجنے برسنے کی صدائیں آئیں۔ پھر یوں لگا کہ شاید انہیں گرفتار کیا جا رہا ہے۔ کچھ دیر بعد تصدیق بھی ہوئی۔ وہ لوگ انہیں گرفتار کر کے لے گئے تھے۔

آنیہ کا دل گھبرانے لگا۔ معدے میں اینٹھن ہو رہی تھی پھر اسے قے شروع ہوگئی۔ کل رات بھی اسی طرح کی کیفیت ہوئی تھی جب راسم نے اسے متلی کی دوا دی تھی...... یہ سخت بے چینی کا وقت تھا۔ آنیہ نے ٹی وی بند کر دیا۔ لائٹ

www.pakistanipoint.com

آف کر دی مگر پھر نہار کی کال آ گئی۔ ساری خبریں اس تک بھی پہنچ گئی تھیں۔ وہ راسم اور آنیہ کے حوالے سے سخت فکر مند تھی...... پھر پاپا کا فون آیا۔ آنیہ کوشش کے باوجود کال اٹینڈ نہیں کر سکی۔ اس نے جواباً بس معذرت کا میسج بھیجا اور اپنی خیریت سے آگاہ کیا۔

سہ پہر کے وقت تھوڑی سی راحت اس وقت ملی جب اسے پتا چلا کہ دلبر ماموں پولیس اسٹیشن سے گھر واپس آ گئے ہیں۔ غالباً ان کا ''سابق فوجی ہونا'' ان کے کام آیا تھا۔ آنیہ ان سے ملی۔ وہ اپنے لیے قطعاً خوف زدہ نہیں تھے۔ انہیں بس آنیہ اور راسم کی فکر تھی۔

تہ خانے میں آنیہ نے جائے نماز سنبھال لی تھی اور راسم کے لیے مسلسل دعا گو تھی۔ رات نو بجے کے لگ بھگ تہ خانے کے دروازے پر زوردار دستک سنائی دی۔ وہ لرز کر رہ گئی۔ دوسری طرف دلبر ماموں تھے۔ اس نے دروازہ کھولا۔ اسے لگا کہ پچھلے کئی گھنٹوں سے جو دعائیں وہ مانگ رہی تھی، وہ رنگ لائی ہیں۔ دلبر ماموں کے ساتھ راسم موجود تھا۔ اس کے سر پر نیلی پگڑی تھی اور اس نے خود کو براؤن رنگ کی گرم چادر میں لپیٹا ہوا تھا۔ اس کے حلیے میں جو تھوڑا سا فرق آیا، وہ یہ تھا کہ ایک رخسار پر چوٹ کا نیلگوں ابھار نظر آ رہا تھا۔

دلبر ماموں نے اسے اندر دھکیل کر جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ باہر سڑک سے گزرتی ہوئی فوجی گاڑیوں کے مخصوص ہارن سنائی دے رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی ایمبولینس بھی شور مچاتی ہوئی گزر جاتی تھی۔ دلبر ماموں واپس چلے گئے۔ آنیہ تڑپ کر راسم کے گلے لگ گئی۔ وہ بھاری آواز میں بولا۔ ''دیوانی ہوئی ہو آنیہ! یہ رونے کا نہیں، خوشی کا موقع ہے۔ اس سؤر کو چیر ڈالا ہے میں نے۔'' اس کا سینہ اندرونی جوش سے کچھ اور بھی فراخ نظر آنے لگا تھا۔ گلے کی رگیں پھولی ہوئی تھیں۔

اس نے راسم سے الگ ہو کر اسے دیکھا۔ اسے راسم کی آنکھوں میں شعلے نظر آئے۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا تھا۔ دیکھا نا، گرا دیا نا سومنات کو۔ اس کی سیاہ جیکٹ کی اندرونی جیب کافی پھولی ہوئی تھی۔ آنیہ نے ٹٹولا۔ کوئی نرم سی چیز تھی۔ ''یہ کیا ہے؟''

راسم نے ذرا تذبذب کے بعد سبز رنگ کا ایک شاپر نکالا۔ اس میں کچھ تھا۔ وہ ہیجانی کیفیت میں بولا۔ ''دل چاہتا تھا کہ تمہیں یہ دکھاؤں...... مگر...... شاید تم ڈر جاؤ گی۔''

''مگر ہے کیا؟''

وہ پھنکارا۔ ''اس بے رحم قاتل کا ہاتھ......'' آنیہ سناٹے میں رہ گئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''ہاں آنیہ اپنے اس ہاتھ سے اس بدبخت نے میرے فاروق کو تڑپا کر مارا تھا اور پھر سدرہ کے سر سے عزت کی چادر اتاری تھی۔ اسی ہاتھ سے اس نے ٹھیکیدار نرائن کے سامنے، مجھے برف کے بلاک پر ننگا لٹایا تھا۔ میں اس حرام زادے کی لاش کا تو کچھ نہیں کر سکا مگر اس ہاتھ کو آوارہ کتوں کی خوراک ضرور بناؤں گا۔''

آنیہ سرتاپا لرز رہی تھی۔ جب ظلم حد سے بڑھتا ہے تو پھر ردعمل میں ایسے ہی واقعات رونما ہوتے ہیں۔ باہر باغ کالونی کی کسی گلی میں اوپر تلے تین چار فائر ہوئے اور پھر آوارہ کتوں کا شور سنائی دینے لگا۔

وہ عجب رات تھی، وہ اکٹھے تھے، ایک دوسرے کے بالکل قریب...... مگر جیسے سیکڑوں میل دور تھے۔ آنیہ نے اس کی طرف کروٹ لی، پھر اس کا دایاں ہاتھ اپنے سرد رخسار اور تکیے کے درمیان رکھتے ہوئے کہا۔ ''راسم! تم نے وعدہ کیا تھا کہ جب تک میں ''اکیلی'' ہوں۔ تم کچھ نہیں کرو گے پھر تم کل رات کیوں نکل گئے؟''

''میرا دل کہتا ہے کہ تم اکیلی نہیں ہو...... اب نہیں ہو۔'' وہ بھی کھوئے لہجے میں بولا۔

وہ چونک سی گئی۔ سر اٹھا کر نیم تاریکی میں اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ اسے یاد آیا کہ اس کو کل رات بھی تو متلی ہوتی رہی تھی۔ اس کی رگوں میں لہو سنسنا سا گیا۔ وہ مسکراتے لہجے میں گویا ہوا۔ ''ہاں آنیہ! یہ تمہاری طبیعت کی خرابی بھی ہو سکتی ہے مگر میرا دل...... میرا وجدان کہتا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ اسی وجدان اور یقین کے سہارے میں کل چلا گیا تھا۔''

وہ کتنی ہی دیر کچھ نہ کہہ سکی۔ اپنے وجود کے اندر کسی اور وجود کی شروعات کا احساس اس کے لیے بڑا انوکھا تھا۔

وہ موضوع بدل کر بولا۔ ''کاش کشمیر آزاد ہو جائے اور وہ آزاد فضاؤں میں پیدا ہو۔'' وہ کچھ نہیں بولی۔ بول ہی نہیں سکی۔ اس نے بات آگے بڑھائی۔ ''بھارت کا یہ مسلم کش حکمران جس طرح کے ظلم توڑ رہا ہے، لگتا ہے کہ اب صبح قریب ہے۔ لوگوں میں ایک بے تاب لہر پیدا ہو رہی ہے۔ کشمیری نوجوان سروں پر کفن باندھ رہے ہیں۔ راجا نے کل ایک عجیب شعر سنایا جو دل پر نقش ہو گیا ہے۔

ہم نے اندھی رات میں توڑا فصیلِ خوف کو
صبح کی پہلی کرن تک یہ حوالہ جائے گا۔''

باہر سرد ہوا چناروں میں سرسرا رہی تھی۔ آنیہ نے

www.pakistanipoint.com

پوچھا۔ ''راسم، کل راجا بھی تمہارے ساتھ تھا؟''

''ہاں، گاڑی میں وہی تھا۔ تمہیں پتا ہے، وہ کون ہے؟'' وہ سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ''پیلٹ گن سے چھلنی ہونے والی خاتون ناہید کا چھوٹا بھائی، بڑا پیار کرتا تھا اپنی آپی سے۔ مزاحمت اور جدوجہد کے یہ سلسلے ایسے ہی رشتوں ناتوں اور جذبوں سے جڑے ہوئے ہیں۔''

بولتے بولتے اچانک راسم کے ذہن میں نہ جانے کیا آیا، کہنے لگا۔ ''آنیہ! کسی وقت سوچتا ہوں، از خود گرفتاری دے دوں۔''

''پلیز راسم۔'' آنیہ نے سسک کر کہا اور اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

اگلی صبح مزید تہلکہ خیز تھی۔ اخبار چلا رہے تھے۔ نیوز چینلز پر بھی سخت شور تھا۔ انڈین فورسز نے پورے علاقے میں نہایت سخت سرچ آپریشن کیا تھا۔ گھر گھر تلاشی لی گئی تھی۔ انہوں نے بڑی بے رحمی سے پندرہ سے زائد کشمیریوں کو مار ڈالا تھا۔ بے شمار گرفتاریاں ہوئی تھیں۔ چادر اور چار دیواری پامال کی گئی تھی۔ آنیہ نے گوگل پر سرچ کر کے کوئی پاکستانی نیوز چینل ٹیون کرنا چاہا مگر ایک بار پھر انٹرنیٹ بند کر دیا گیا تھا۔ اس نے ٹرانزسسٹر ریڈیو پکڑا اور پاکستانی نیوز سننے میں کامیاب رہی۔ ریڈیو کے مطابق شہید ہونے والے کشمیریوں کی تعداد تیس سے کم نہیں تھی۔ علاقے سے چار سو کے قریب افراد گرفتار کیے گئے تھے۔ دو قریبی دیہات سے انڈین فوجی تین کشمیری لڑکیوں کو اٹھا کر لے گئے تھے، ان پر سہولت کاری کا الزام لگایا گیا تھا۔ ایریا میں کرفیو نافذ کر دیا گیا تھا۔ شہادتوں کی وجہ سے پورے راجوری میں شدید غم و غصہ پایا جا رہا تھا۔

آنیہ کو لگا کہ راسم ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا ہے۔ دوپہر تک آنیہ کو خوف محسوس ہوا کہ وہ جذبات کے دھارے میں بہہ کر پھر کہیں نہ نکل جائے۔ اس نے دلبر ماموں سے کہہ کر موٹر بائیک غائب کروا دی اور انہیں راسم کی طرف سے پوری طرح چوکس کر دیا۔ آج اسے پتا چل رہا تھا کہ کل رات اس نے اچانک یہ بات کیوں کہی تھی کہ وہ اپنی گرفتاری دینا چاہتا ہے۔ شاید اس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ اندیشہ موجود تھا کہ کہیں اروڑا کے قتل کا ردِعمل بے گناہوں کے لیے جان کا خطرہ نہ بن جائے۔

آکاش اروڑا کے قتل اور پھر پچیس کے قریب بے گناہ کشمیریوں کی شہادت کے بعد علاقے میں زبردست انتشار پیدا ہو گیا تھا۔ راجوری کی گلیوں میں چھوٹے احتجاج ہوئے تھے۔ ٹائروں کو آگ لگائی گئی اور فوجی گاڑیوں پر سنگ باری ہوئی تھی۔ اب لوگ ایک بڑے اور منظم احتجاج کی طرف بڑھ رہے تھے۔ کہا جا رہا تھا کہ باغ کالونی میں جہاں ایک ہی گلی میں سات لوگوں کو شہید کیا گیا، ایک بڑا مظاہرہ کیا جائے گا۔ جمعے کے روز ہزاروں لوگ جمع ہوں گے اور پُرامن طور پر اس درندگی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں گے۔

یہ اضطراب قریبی علاقوں تک بھی پھیل گیا تھا۔ کہا جا رہا تھا کہ کلگام اور اننت ناگ سے بھی لوگ قافلوں کی صورت یہاں پہنچیں گے۔ بوائز ہاسٹل سے آگے ایک بڑا پلے گراؤنڈ تھا جس کے ساتھ ایک وسیع میدان بھی تھا۔ یہ اجتماع یہیں پر ہونے والا تھا۔ میدان سے کچھ فاصلے پر شمال کی طرف ایک فوجی کیمپ تھا جس کے گرد خاردار باڑ لگی ہوئی تھی۔ مقامی انتظامیہ کسی صورت یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ راجوری میں اتنا بڑا جلسہ ہو۔ دیکھنے والے یہ سوچ سکتے تھے کہ اگر یہاں اتنی بڑی تعداد میں لوگ جمع ہو سکتے ہیں تو پھر سرینگر اور پلواما جیسے علاقوں میں کتنے بڑے پیمانے پر احتجاج ہو سکتا ہے۔ لہٰذا خبریں یہی آ رہی تھیں کہ یہ اجتماع ہونے ہی نہیں دیا جائے گا۔ دوبارہ کرفیو لگا دیا جائے گا یا پھر بڑے پیمانے پر مزید گرفتاریاں کر لی جائیں گی۔ ایک اطلاع یہ بھی تھی کہ سخت گیر ہندو ڈی سی اس پلے گراؤنڈ اور میدان میں پانی چھوڑ دینے کا ارادہ رکھتا ہے۔

جوں جوں رکاوٹ کی اطلاعات آ رہی تھیں توں توں لوگوں کا غم و غصہ اور جوش بڑھ رہا تھا۔ وہ بدمست انڈین فوجیوں کی طرح خون خرابا نہیں کر رہے تھے، لوٹ مار کا ارادہ نہیں رکھتے تھے، صرف بھارتی فوجیوں کی حد سے بڑھی ہوئی سفاکی کے خلاف عوامی طاقت کا پُرامن اظہار چاہتے تھے۔ جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کے مقامی لیڈران بھی احتجاج کے اس پروگرام میں پیش پیش تھے۔

آنیہ دیکھ رہی تھی۔ پچھلے اڑتالیس گھنٹوں میں راسم عجیب کیفیت میں رہا تھا۔ وہ اس کے پاس ہوتے ہوئے بھی اس کے پاس نہیں تھا۔ اس کے سینے میں جیسے نیلے شعلے بھڑک رہے تھے۔ وہ ٹی وی اور ریڈیو کے ذریعے پل پل کی خبر رکھے ہوئے تھا۔ دوپہر کو دلبر سنگھ جی تہ خانے میں آئے۔ انہوں نے راسم کو بتایا۔ ''مقامی کشمیری رہنماؤں اور انتظامیہ میں ایک ایگریمنٹ ہوا ہے۔ انتظامیہ کو پوری طرح وشواس دلایا گیا ہے کہ اس احتجاج کے دوران میں

www.pakistanipoint.com

لوگ بالکل شانتی کے ساتھ رہیں گے۔ گارنٹی دی گئی ہے کہ کوئی ایک شیشہ نہیں ٹوٹے گا، ایک گملا خراب نہیں ہوگا۔ چار بجے سہ پہر کے بعد چند تقریریں ہوں گی اور اس کے بعد مغرب سے پہلے پہلے لوگ شانتی کے ساتھ منتشر ہو جائیں گے۔''

''آپ کا کیا خیال ہے دلبر جی، کیا واقعی ایسا ہو سکے گا؟'' راسم نے پوچھا۔

''ہندو مہاشے پر وشواس کرنا تو مشکل ہے مگر یہ باوردی جانور اڑتالیس گھنٹے پہلے پچیس بے گناہوں کی ہتھیا کر چکے ہیں۔ ہر طرح کا ظلم ڈھا چکے ہیں۔ اب شاید ان کے اندر خون کی پیاس تھوڑی سی گھٹ (کم) پڑ گئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ''پُرامن'' ''پروٹیسٹ'' کی آگیا دے رہے ہیں۔''

''دلبر جی! کیا پتا وہ دہری چال چل رہے ہوں۔ ایک طرف احتجاج یعنی جلسے کی اجازت دے رہے ہوں، دوسری طرف لمبی چوڑی گرفتاریاں کر لیں۔''

''یار لوگوں نے اس کا بندوبست بھی کیتا ہویا ہے۔'' دلبر جی جوش سے بولے۔ ''جن کی گرفتاریاں ہو سکدی ہیں ان میں سے زیادہ تر رات سے ہی روپوش ہو گئے ہیں۔ رب نے چاہا تو اپنے کچھ سکھ جتھے بھی اسی جلسے میں شریک ہوں گے۔ راجوری والے جتھے کے آگو (لیڈر) دلجیت سنگھ فوج کے زمانے سے میرے یار ہیں۔ وہ بھی رات سے زیرِ زمین ہیں۔ عین ٹائم پر اپنے لوگوں کے ساتھ یہاں باغ میں پہنچ جائیں گے۔''

دلبر سنگھ جی کے گلے کی رگیں جوش سے پھولی ہوئی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ کشمیر کی آزادی میں انہیں خالصتان کی آزادی کی جھلک بھی نظر آ رہی ہے۔ شاید اسی لیے ایک روز انہوں نے کہا تھا۔ صرف کشمیر کی کشتی ہی نہیں، ساری کشتیاں کنارے لگیں گی۔

جمعرات کی شام تک باغ کے جلسے اور اجتماع کی خبر ایک اہم ترین خبر بن چکی تھی۔ راجوری میں بھی ہر طرف اسی کا چرچا تھا۔ مقامی کشمیری رہنماؤں کی طرف سے بار بار اعلان کیا جا رہا تھا کہ یہ قطعی طور پر ایک پُرامن احتجاج ہو گا۔ لہٰذا سب لوگ ایسے شرپسندوں سے ہوشیار رہیں جو اس زبردست عوامی اجتماع کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔

رات کو آنیہ کا پریگنینسی ٹیسٹ کا نتیجہ آ گیا تھا۔ وہ واقعی امید سے تھی۔ اسے خوشی ہوئی تھی لیکن خوشی کے ہر پھول کے ساتھ غم کا وہی زہریلا کانٹا بھی تھا جو سوچ کی پوروں کو زخمی رکھتا تھا۔ اب وہ آزاد ہے، اب وہ چلا جائے گا...... وہ سوچ رہی تھی۔ کیا یہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کرے گا کہ جو اس دنیا میں آنے والا ہے، وہ کون ہے؟ کیا وہ اس کی شکل دیکھنے کا انتظار بھی نہیں کرے گا؟ اس کا دل درد سے بھر گیا۔

رات کو اسے کافی دیر متلی ہوتی رہی۔ پھر واش روم میں منہ ہاتھ دھو کر اور اپنے بال سمیٹ کر وہ راسم کے قریب بستر پر آن لیٹی۔ ''راسم، کل تم بھی مظاہرے میں جاؤ گے؟''

''یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے آنیہ؟''

''نہ جاؤ نا، ابھی اروڑا والا معاملہ تازہ ہے۔ تمہارے لیے بہت خطرہ ہوگا۔''

''خطرے والی بات اچھی کہی ہے تم نے۔ کہاں خطرہ نہیں ہے میرے لیے؟ اس ہجوم میں تو میرے لیے سب سے کم خطرہ ہوگا۔'' اس نے سامنے ٹی وی اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہ دیکھو...... یہ کچھ لوگ کل والے جلوس کی ریہرسل کر رہے ہیں۔ یہ کوئی دو سو موٹر سائیکل سوار تو ہوں گے۔ ان میں سے بہت سے ایسے ہیں جنہوں نے اپنے چہرے نقابوں میں چھپائے ہوئے ہیں۔ وہاں ہزاروں میں کسی کو کون پہچان سکتا ہے اور پھر، اب تو یہ بات طے ہو چکی ہے کہ یہ ایک مکمل پُرامن مظاہرہ ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ جلسہ گاہ کے باہر چند ٹائر جلائے جائیں گے یا دو چار پتلے نذرِ آتش ہو جائیں گے۔''

''اور پھر اس کے بعد......؟'' آنیہ نے پوچھا۔ ''یعنی آنے والے دنوں میں؟''

''اس کے بعد کچھ بھی ہو سکتا ہے۔'' وہ گمبھیر آہنگ میں بولا۔ ''میں وقت سے پہلے کیا کہہ سکتا ہوں۔'' اس نے ہولے سے آنیہ کا ہاتھ تھام لیا اور کہا۔ ''اگر کچھ ہو جائے تو تم پاپا کے پاس جالندھر چلی جانا۔ میرا خیال ہے کہ برقع میں سفر کرتے ہوئے تمہیں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ میں نے خیرو کو ساری بات سمجھا دی ہے۔ وہ تمہارے ساتھ جائے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ دلبر جی خود تمہیں چھوڑ آئیں۔''

''ایسی باتیں کیوں کرتے ہو راسم! میرے دل کو کچھ ہوتا ہے۔'' وہ رو دی۔

''آنیہ، میری جان! تمہیں اپنے دل کو مضبوط کرنا ہو گا۔ تمہارے پاس میری امانت ہے اور وہ تمہیں شاید مجھ سے بھی زیادہ پیاری ہو۔ اسے سنبھالنا ہے۔ اس کے مستقبل کے بارے میں سوچنا ہے۔''

www.pakistanipoint.com

''لیکن راسم! میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ تمہارے ساتھ جینا اور مرنا چاہتی ہوں۔''

اس نے پیار سے آنیہ کا رخسار سہلایا۔ ''اب تم نے یہ آپشن کھودیا ہے آنیہ، تمہیں اب زندہ رہنا ہے۔ دلیری کے ساتھ اور مجھے پتا ہے تم رہوگی۔ تم نے مجھے بتایا تھا تم ہمیشہ دلیری کی پرستار اور متلاشی رہی ہو لیکن اب تم خود دلیر بنوگی۔ تمہارے وجود میں جو موجود ہے وہ تمہیں دلیر بنائے گا۔ تمہیں اور ڈھنگ سے جینا سکھائے گا، مجھے پورا یقین ہے۔''

اچانک لائٹ چلی گئی۔ تاریکی چھا گئی۔ ٹی وی آف ہوگیا۔ کچھ دیر بعد قدموں کی چاپ ابھری۔ دستک ہوئی۔ خیرو ایک شمع دان اندر لے آیا۔ اس نے بتایا کہ کل کے جلسے کے لیے لوگ بڑے پیمانے پر تیاری کررہے ہیں۔ برہان وانی شہید کی تصویروں اور دیگر شہیدوں کی تصویروں والے بینرز تیار ہورہے ہیں۔ پلے گراؤنڈ کے ساتھ والے وسیع میدان میں اسٹیج تیار کیا جارہا ہے۔ خیرو خود بھی پُرجوش دکھائی دیتا تھا۔

راسم نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تو جلیانوالا باغ یاد آرہا ہے۔ شاید وہاں بھی اس سے ملتی جلتی صورتِ حال ہوگی۔ وہی جبر اور وہی صبر، وہی بربریت اور وہی مزاحمت۔ دور بدل جاتے ہیں، مقام بدل جاتے ہیں مگر جنگ تو وہی رہتی ہے۔''

آنیہ نے کن انکھیوں سے راسم کا چہرہ دیکھا...... وہ جانتی تھی یہ کون بول رہا ہے؟ یہ جلیانوالا کے اسداللہ حیدر کا خون بول رہا تھا۔ اسے ایسے ہی بولنا چاہیے تھا۔

ایک بار پھر اس کی سوچوں کی پوروں کو غم کا نکیلا کانٹا لہولہان کرنے لگا۔ اس نے لیٹے لیٹے راسم کے مضبوط شانے سے ماتھا ٹیکا اور بھرائی آواز میں بولی۔ ''راسم! جس راہ پر چل پڑے ہو، اس سے کوئی واپسی بھی ہے یا نہیں؟''

وہ گم صم سا ہوگیا۔ چند لمحے کے لیے آنیہ کو یوں لگا جیسے وہ کوئی جواب ہی نہیں دے گا پھر وہ بولا۔ ''جب تک سانس تب تک آس۔ ناامیدی تو کفر کہلاتی ہے۔ ہم نے آزاد ہونا ہے۔''

''مجھے پہیلیاں نہ بجھواؤ راسم۔ مجھے صاف صاف بتاؤ پلیز۔ تمہیں تو پتا ہوگا جو راہ اختیار کرلی ہے، اس میں واپسی کا امکان کیا ہے؟''

وہ عجیب انداز میں مسکرایا۔ ''زندگی موت کی ''ریشو'' جاننا چاہتی ہو۔'' پھر وہ اٹھا۔ شمعدان میں چھ شمعیں روشن تھیں۔ اس نے ایک ایک کرکے ساری بجھادیں۔ بس ایک شمع کا فیتہ ذرا سلگتا رہنے دیا۔ فیتے کے اوپر ایک چنگاری سی چمک رہی تھی۔ ''ریشو تو بس یہی ہے آنیہ۔''

وہ اپنے گرم آنسوؤں سے اس کا شانہ بھگونے لگی۔ پتا نہیں کیوں اسے لگتا تھا کہ یہ آخری رات ہے۔ اس آخری رات میں وہ اس کے سوا اور کیا کرسکتی تھی۔ وہ قول دے چکی تھی، کچھ بھی اس کے اختیار میں نہیں تھا۔

اگلے روز راسم صبح سویرے ہی اٹھ گیا تھا۔ آنیہ نے اسے نماز پڑھتے دیکھا پھر اس نے اپنی داڑھی درست کی اور بڑی بڑی مونچھیں تقریباً صاف کردیں۔ اس نے کل رات ہی کہا تھا کہ وہ جلسے میں جانے کے لیے ایک مسلمان کی شکل میں ہی نکلے گا۔ آنیہ نے بڑے اہتمام سے ناشتا بنایا تھا مگر اس نے فقط چند لقمے ہی لیے...... پھر وہ دوسرے کمرے میں گھس گیا۔ اس نے آنیہ سے کچھ رُوئی اور سُوئی دھاگا مانگا تھا۔ دوپہر کے وقت آنیہ نے دیکھا کہ وہ انڈین وزیراعظم کا ایک پُتلا سی رہا ہے۔ اس نے کشمیر کا ایک جھنڈا بھی تیار کررکھا تھا۔ آنیہ نے دلبر ماموں کی آواز سن کر دروازے کی جھری سے آنکھیں ہٹائیں اور بیسمنٹ سے باہر نکلی۔ اس نے دیکھا، دلبر ماموں نے ایک مسلمان پینٹر سے ایک بڑا بینر تیار کروایا تھا۔ اس پر لکھا تھا۔ ''گجرات کے قسائی کو اب اپنے ہر ظلم کا حساب دینا ہوگا۔''

☆☆☆

آنیہ کو گم صم دیکھ کر راسم نے کہا۔ ''گھبراؤ مت، دعا کرو جلسہ خیریت سے گزر جائے۔ شام کو تمہارے پاس ہوں گا۔''

سہ پہر کو ہی مظاہرین کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں نعرہ زنی کرتی ہوئی جلسہ گاہ کی طرف بڑھنے لگی تھیں۔ دلبر ماموں اور خیرو بھی نکل چکے تھے۔ راسم بھی تیاری میں تھا۔ اس نے سفید شلوار قمیص پر سفید گول ٹوپی اوڑھ رکھی تھی۔ ایک بڑا، ریشمی رومال اس نے نقاب کے طور پر استعمال کرنا تھا۔ وہ ذرا دیر کے لیے چھت پر گیا تو آنیہ کو اپنا ایک شک رفع کرنے کا موقع مل گیا۔ اس نے انڈین وزیراعظم کا نارنجی رنگ کا پُتلا دیکھا۔ چند سیکنڈ بعد اس کی رگوں میں خون سنسنا کر رہ گیا۔ پُتلے کے اندر ایک آٹومیٹک رائفل مع گولیوں والی بیلٹ کے چھپائی گئی تھی۔ یہ وہی رائفل تھی جو دلبر ماموں نے چند دن پہلے خطرے کے وقت بیسمنٹ والی الماری سے نکالی تھی۔

راسم واپس آیا تو آنیہ نے پُتلے کی طرف اشارہ کیا اور

www.pakistanipoint.com

چلّا اٹھی۔ ”راسم! تم یہ کیا کر رہے ہو۔ کیا ارادے ہیں تمہارے؟ میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔ ہرگز نہیں جانے دوں گی۔“

”آنیہ۔“ وہ گرجا۔ ”اس بحث کا وقت نہیں ہے، یہ صرف احتیاط......“

”جھوٹ مت بولو۔ خدا کے لیے رحم کرو مجھ پر۔“ اس نے اسے دونوں کندھوں سے تھام لیا۔ راسم اسے گہری نظروں سے دیکھتا رہا پھر یکایک اس نے اسے دھکا دیا اور پُتلے سمیت کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ دروازے تک پہنچتی، وہ اسے باہر سے لاک کر چکا تھا۔ وہ دروازہ پیٹنے لگی۔ راسم کو پکارنے لگی، وہ آہنی گرل اور جالی والی کھڑکی کی طرف لپکی۔ وہ دوسری طرف کھڑا تھا۔ ”راسم! تم دھوکا دے رہے ہو مجھے۔ جھوٹ بول رہے ہو مجھ سے۔ تم شام کو واپس نہیں آؤ گے...... تم...... کبھی واپس نہیں آؤ گے۔“

وہ ٹھہری آواز میں بولا۔ ”آنیہ! میں تمہیں بتا چکا ہوں یہ گن میں صرف احتیاط کے طور پر لے جا رہا ہوں۔ یہ ایک پُرامن جلسہ ہے لیکن ہمارا دشمن دھوکے باز ہے۔ اس پر مکمل بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ان کی طرف سے کچھ نہیں ہوگا تو پھر ہماری طرف سے بھی کچھ نہیں ہوگا۔“

”اور اگر کچھ ہو ہی گیا تو؟“ وہ کھڑکی سے منہ لگا کر چلّائی۔ ”کیا تم، آج ہی خود کو گولیوں سے چھلنی کروالو گے؟ آج ہی ہتھکڑیاں پہن کر پھانسی کی کوٹھری کی طرف چل پڑو گے؟“

اس کی آنکھوں میں شعلہ بھڑکا۔ وہی یادگار شعلہ جو جلیانوالا کی ایک دیوار کے پاس گرے ہوئے دس سالہ لڑکے کی آنکھوں میں نظر آیا تھا۔ وہ عجیب الوہی لہجے میں بولا۔ ”آنیہ! وہ بھی ایک باغ تھا جس کی تصویر تمہارے پاس ہے اور یہ بھی باغ ہے لیکن اس بار نہیں...... ہاں اس بار نہیں۔“

”کیا اس بار نہیں؟“ وہ پھر چلّائی۔

”اگر اس طرح کی کہانی یہاں بھی دہرائی گئی...... تو میں یہ ہونے نہیں دوں گا۔ تم دیکھ لینا میں یہ ہونے نہیں دوں گا......“

وہ بلک اٹھی۔ ”راسم! تم گولیاں چلاؤ گے؟ خون بہاؤ گے؟“

”گولیاں تو چل رہی ہیں، خون تو کشمیریوں کا بہہ رہا ہے۔ اب اسے روکنا ہے، کسی بھی طرح روکنا ہے۔“

اس نے الوداعی نظروں سے دیکھا اور تیزی کے ساتھ کھڑکی کے سامنے سے اوجھل ہوگیا۔

☆☆☆

یہ بہت بڑا جلسہ تھا۔ ہزاروں لوگ تھے۔ ان میں خواتین اور بچوں کی بڑی تعداد بھی تھی۔ یقیناً سب کے سینے سلگ رہے ہوں گے مگر اپنے قائدین کی ہدایت کے مطابق وہ سب پُرامن تھے۔ ہاں ان کے کتبوں اور بینرز سے ان کے اندرونی غم و غصے کا اظہار ضرور ہوتا تھا۔ ایک بڑے بینر پر لکھا تھا۔ ”بے شک نعرے بھی ہوں گے...... لیکن اب للکارے بھی ہوں گے۔“

ایک بینر جو جگہ جگہ نظر آ رہا تھا اس پر مقبول بٹ، برہان وانی اور نصیر احمد پنڈت کی تصویریں تھیں۔ نیچے سرخ روشنائی سے درج تھا۔ شہید کی جو موت ہے، وہ قوم کی حیات ہے۔ دو اور نعرے بار بار فضاؤں میں گونج رہے تھے، وہ یہ تھے۔ ”ہم نہیں مانتے...... ظلم کے ضابطے“ اور ”کشمیر بنے گا پاکستان“۔ جلسہ گاہ کے اردگرد عمارتوں کی چھتوں پر اور کیمپ کی جانب بہت سے فوجی شوٹر بالکل چوکس موجود تھے۔ وہ چاروں طرف گہری نگاہ رکھے ہوئے تھے۔

آنیہ بالائی منزل کی کھڑکی میں کھڑی پردے کی اوٹ سے دیکھ رہی تھی۔ کچھ ہی فاصلے پر اسے جلسہ گاہ کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ایک چھوٹی کھڑکی کی جالی کاٹ کر بمشکل کمرے سے نکل سکی تھی۔ جلسہ گاہ میں ایک جوشیلا نوجوان اپنے ساتھیوں کے کندھوں پر موجود تھا۔ وہ اپنے سینے کی پوری قوت سے چلّایا۔ ”لے کے رہیں گے۔“ سیکڑوں لوگوں نے جواب دیا۔ ”آزادی“ وہ پھر پکارا۔ ”میں مر بھی جاؤں تو“ سیکڑوں لوگوں نے کہا۔ ”آزادی“ وہ پھر دہاڑا۔ ”میری قبر پر لکھنا“ جواب آیا۔ ”آزادی“ ”ذرا زور سے بولو...... آزادی...... دل کھول کے بولو...... آزادی......“

آنیہ سنتی رہی۔ رگوں میں لہو سنسناتا رہا۔ کہیں پس منظر میں نغمہ گونج رہا تھا۔ دنیا کے منصفو، سلامتی کے ضامنو! کشمیر کی جلتی وادی میں بہتے ہوئے خون کا شور سنو۔

اور پھر کچھ دیر بعد تقریریں شروع ہوگئیں۔ لوگ بڑے نظم وضبط سے سنتے رہے۔ کہیں کوئی یورش نہیں تھی، کوئی اُچھل پُھل نہیں تھی۔ اس کی امید بندھنے لگی کہ سب کچھ خیرو عافیت سے اختتام پذیر ہوجائے گا۔ تقریریں ختم ہوں گی تو لوگ نماز مغرب سے پہلے منتشر ہوجائیں گے اور پھر...... پھر

www.pakistanipoint.com

وہ بھی چلا آئے گا۔ خدا کے گھر میں کس چیز کی کمی ہے۔ وہ ہونی کو انہونی اور انہونی کو ہونی کر کے دکھا دیتا ہے۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی کہ آج رات کا کھانا وہ اور راسم پھر اکٹھے کھاتے۔ پھر مستقبل کے بارے میں سوچتے۔ پھر حالات کی بے رحم دیواروں کے اندر سے زندگی کا کوئی در نکالنے کی کوشش کرتے۔ سورج مغرب کی طرف جھکتا گیا اور آنیہ کی امید کی روشن کرنیں طلوع ہوتی گئیں۔ اچانک اسے اس ٹیلی اسکوپ کا خیال آیا جو ایک روز اس نے بیسمنٹ کی الماری میں دیکھی تھی۔ وہ اپنے سفید گلابی پاؤں سیڑھیوں پر احتیاط سے رکھتی، تیزی سے نیچے آئی اور وہ لونگ رینج کی دوربین لے کر پھر تیسری منزل کی اس کھڑکی تک چلی گئی۔ وہ ہزاروں کے ہجوم میں راسم کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگی۔ کوشش کے باوجود وہ اسے دیکھ نہیں سکی۔ تاہم ایک جگہ اس نے دلبر ماموں کو ان کی سرخ پگڑی کی وجہ سے پہچان لیا۔ وہ بڑی محویت سے تقریر سن رہے تھے۔ اب جلسہ آخری مراحل میں تھا۔

اچانک ایک دھماکا ہوا۔ یہی لگا کہ کسی بڑی گاڑی کا ٹائر برسٹ ہوا ہے مگر اس آواز کی وجہ سے لوگوں میں یکایک ہلچل پیدا ہوئی۔ دائیں جانب کے ہجوم میں کچھ بھگدڑ سی نظر آئی۔ آنیہ نے دیکھا کہ کچھ لوگ مخالف سمت میں بھاگے۔ اس جانب کچھ دوری پر فوجی کیمپ بھی تھا۔ فائر کرنے والوں کو تو شاید بہانہ ہی چاہیے تھا (اور جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ بہانہ انہوں نے ٹائر بلاسٹ کی شکل میں خود ہی ''تخلیق'' کیا تھا۔ درحقیقت اتنا بڑا اجتماع ان سے ہضم ہی نہیں ہو پایا تھا) پہلے کچھ ہوائی فائرنگ کی گئی اور آنسو گیس پھینکی گئی تب دفعتاً سیدھی فائرنگ ہونے لگی۔ آنیہ کا دل اچھل کر گلے تک آ گیا۔ اس نے نہتے لوگوں کو زخم کھاتے دیکھا۔ قیامتِ صغریٰ کا سا منظر نظر آیا۔ جہاں چند لمحے پہلے ہزاروں لوگ تھے، وہاں اب کربناک آوازوں، افراتفری کی لہروں اور بھاگ دوڑ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ٹیلی اسکوپ آنیہ کی آنکھوں سے لگی تھی...... اور یہی وہ لمحے تھے جب اس نے دو نوجوانوں کو دیکھا۔ ان میں سے ایک راسم تھا......

ہاں وہ راسم ہی تھا۔ اس کے سر سے ٹوپی اتر چکی تھی۔ لمبے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اس کے پاس وہی رائفل ''اے کے 57'' تھی۔ وہ جوابی فائر کر رہا تھا۔ وہ اپنے ساتھی کے ساتھ مل کر ان قاتلوں کو نشانہ بنا رہا تھا جو نہتے لوگوں پر گولیوں کی بوچھاڑ کر رہے تھے۔ آنیہ نے کچھ انڈین فوجیوں کو ''ہٹ'' ہو کر چھتوں سے گرتے دیکھا جو فوجی دستہ زمین پر تھا، وہ بھی اس اچانک جوابی کارروائی سے بدحواس ہوا۔ وہ فوجی آڑ کی تلاش میں پیچھے ہٹے۔ ان کی رائفلیں کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئیں۔ اسی دوران میں بےشمار لوگوں کو بھاگنے اور جانیں بچانے کا موقع مل گیا۔ آنیہ کی نگاہیں راسم پر چپکی ہوئی تھیں۔ اچانک اسے گولی لگی۔ وہ لڑکھڑا کر پشت کے بل گرا۔ اس کی گن اس کی گرفت سے نکل کر دور لڑھک گئی۔

''راسم...'' آنیہ چلا کر رہ گئی۔ چند لمحوں کے لیے اس کا جی چاہا وہ دوڑتی ہوئی جائے اور زخمی راسم کے پاس جا پہنچے، اپنے جسم کو اس کی ڈھال بنا دے مگر یہ ممکن نہیں تھا۔ کرب کے عالم میں اس نے ٹیلی اسکوپ پھر آنکھوں سے لگائی۔ زخمی حالت میں راسم نے اپنی گن پھر اٹھالی تھی۔ اس کے جسم پر خون کے دھبے نظر آ رہے تھے۔ گولی اس کے سینے یا کندھے پر دائیں جانب لگی تھی۔ وہ اپنے ساتھی کے ساتھ لڑکھڑاتا ہوا بھاگا۔ دونوں پلٹ کر فائر بھی کر رہے تھے پھر وہ جلسہ گاہ سے باہر ایک گلی میں داخل ہو گئے۔ آنسو گیس کے دھوئیں نے دیکھنا محال کر رکھا تھا مگر آنیہ کی اشک بار نگاہیں اپنے راسم سے چپک کر رہ گئی تھیں۔ راسم اور اس کا ساتھی اب ایک خم دار گلی میں بھاگ رہے تھے۔ کچھ مسلح فوجی ان کے پیچھے لپک رہے تھے، کسی بھی لمحے وہ ان پر گولیوں کی بوچھاڑ کر سکتے تھے۔ انہیں کیا فکر تھی اگر کوئی اور بھی گولیوں کی زد میں آتا۔ کچھ آگے جا کر راسم اور اس کا ساتھی علیحدہ ہو گئے۔ راسم بائیں جانب والی ایک تنگ گلی میں مڑ گیا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ اپنے پیچھے لپکنے والے موت کے ہرکاروں کو جل دینا چاہتا ہے۔ کیا وہ ایسا کر سکے گا؟ آنیہ سوچ رہی تھی اور اس کا دل دھڑکنا بھول گیا تھا۔ وہ خود کو بچانے کے لیے اندھا دھند بھاگ رہا تھا۔ کسی وقت دو تین سیکنڈ کے لیے آنیہ کی نظروں سے اوجھل بھی ہو جاتا تھا، پھر نظر آنے لگتا تھا۔

پھر وہ آنیہ کو بہت فاصلے پر نظر آیا۔ وہ اب بھی بھاگ رہا تھا لیکن اب اس کے تعاقب میں کوئی نہیں تھا۔ گن اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے لمبے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اس کے سامنے گھنے درخت تھے...... اور پھر پہاڑیوں کا طویل سلسلہ تھا۔ یکایک آنیہ نے دیکھا، ایک جانب سے دو موٹر سائیکل سوار نمودار ہوئے۔ راسم جھپٹ کر ایک سوار کے عقب میں بیٹھ گیا۔ آنیہ نے کانپتے ہاتھوں سے ٹیلی اسکوپ کا فوکس درست کیا۔ اس نے دیکھا یہ موٹر سائیکل سوار راجا تھا۔ دوسرا موٹر سائیکل سوار خیرو کا داماد امیر حمزہ تھا۔ اس کے

www.pakistanipoint.com

ماتھے پر ”اللہ اکبر“ کے الفاظ والا ہیڈ بینڈ نظر آرہا تھا۔ وہ تھوڑا آگے گئے تو ایک موٹر بائیک مزید ان میں شامل ہو گئی۔ اس پر بھی دو کشمیری نوجوان سوار تھے۔ انہوں نے چہروں پر رومال باندھ رکھے تھے۔ ان میں سے ایک کے کندھے پر کوئی لمبوتری چیز جھول رہی تھی...... ہاں وہ راکٹ لانچر تھا...... ایسا ہی راکٹ لانچر دوسرے سوار کے کندھے پر بھی تھا۔ وہ برق رفتاری سے پہاڑیوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ گاہے گاہے مڑ کر عقب میں بھی دیکھ لیتے تھے۔ وہ پیچھے آنے والے ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھے اور ان میں راسم بھی تھا لیکن فی الحال خطرہ کوئی نہیں تھا۔ وہ آگے بڑھتے چلے گئے...... وہ پہاڑیوں میں داخل ہو گئے۔

آنیہ کی ٹیلی اسکوپ اب بھی ان کا تعاقب کر رہی تھی۔ وہ اپنی رائفلیں لہرا رہے تھے...... وہ نعرے لگا رہے تھے...... اور وہ دور جا رہے تھے۔ پہاڑیوں میں گم ہو رہے تھے......

جب ہونٹ سی دیے جائیں، جب آنکھیں اندھی کر دی جائیں، جب دھڑکنوں کو زنجیر کر دیا جائے تو پھر ایسے ہی ویرانے، جانبازوں کو پناہ دیا کرتے ہیں...... اور پھر انہی ویرانوں میں سے ایک دن آزادی کا مسکراتا ہوا سورج طلوع ہوتا ہے۔

ٹیلی اسکوپ ایک طرف رکھ کر آنیہ فرش پر بیٹھ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ آج شام اور آنے والی شاموں میں اب یہاں کسی کو نہیں آنا۔ وہ شہادت کا راہی تھا اور اپنے سفر پر روانہ ہو چکا تھا۔

انڈین فورسز کی طرف سے اسٹیج کیے جانے والے اس سنگین ہنگامے میں پانچ کشمیریوں کی جان گئی اور کچھ زخمی ہوئے۔ یہ قیمتی جانوں کا نقصان تو بے شک تھا مگر جتنا اندیشہ کیا جا رہا تھا، اتنا نہیں تھا اور اس کی وجہ یہی تھی کہ عین موقع پر بھارتی فوجیوں کو اپنی پڑ گئی تھی۔ کہا جا رہا تھا کہ بھارتی فوجیوں نے اپنی چار لاشیں اٹھائی ہیں اور کئی زخمی بھی ہوئے ہیں۔ جلسے کے شرکا میں سے جو لوگ زخمی ہوئے تھے ان میں سے ایک دلبر سنگھ جی بھی تھے۔ ان کی ٹانگ میں دو گولیاں لگی تھیں۔ بھارتی فوجی انہیں مارتے اور گھسیٹتے ہوئے ایک ”قیدی گاڑی“ میں ڈال کر لے گئے تھے۔ دلبر جی آخر تک ست سری اکال کے پُرجوش نعرے لگاتے رہے تھے۔ شام کے بعد آنیہ کو راسم کا لکھا ہوا خط ملا۔ یہ چھوٹا سا خط وہ بیڈ کے سرہانے کے نیچے رکھ گیا تھا۔

☆☆☆

دو ماہ گزر چکے تھے۔ آنیہ اپنے شہر جالندھر واپس آ چکی تھی۔ پاپا ہر وقت اس کی دلجوئی میں لگے رہتے تھے۔ ماما بہت کم بات کرتی تھیں۔ آنیہ اپنے کمرے میں بیٹھی تھی کہ نہار کی کال آئی۔ آنیہ اسی کال کا انتظار کر رہی تھی۔ کل آنیہ نے الٹرا ساؤنڈ اور بلڈ ٹیسٹ کرایا تھا۔ نہار نے کہا۔ ”آنیہ جانی! رپورٹ آگئی ہے مبارک ہو...... رب نے چاہا تو بیٹا پیدا ہوگا۔“

آنیہ کے جسم میں سنسناہٹ جاگی۔ دل عجیب گداز سے بھر گیا۔ وہ اٹھی اور آہستہ آہستہ چلتی الماری تک پہنچی۔ ایک مقفل دراز کھول کر اس نے ایک تہ شدہ کاغذ نکالا۔ یہ وہی خط تھا جو راسم نے جاتے ہوئے لکھا تھا۔ وہ اسے بیسیوں مرتبہ پڑھ چکی تھی۔ ایک بار پھر پڑھنے لگی۔

”آنیہ! کشمیر کی غلامی کے دن گنے جا چکے ہیں۔ آزادی کی صبح ضرور طلوع ہوگی۔ بہت جلد ایک ایسا سورج نکلے گا جو سہانے موسموں کی نوید دے گا۔ اس صبح مجھے بھی یاد کرنا...... بھول نہ جانا۔ ارے تم تو پھر آنکھوں میں موتی لے آئی ہو...... اچھا چلو...... دوسری بات کرتے ہیں...... اس دن وہ چھ شمعیں بجھ گئی تھیں لیکن ایک شمع کے سرے پر ایک چنگاری تو موجود تھی ناں۔ چلو اتنی ہی امید سہی۔ جب آزادی کی صبح طلوع ہوئی اور میں تب تک زندہ بھی ہوا تو تمہارے پاس لوٹ آؤں گا...... ہاں آنیہ! بس یہ دو ہی شرطیں ہیں، آزادی کی صبح اور میری زندگی...... اور اگر نہ آسکا تو تم پوری طرح آزاد ہو۔ ایسی صورت میں بس ایک ہی درخواست ہے میرے بچے کو میرا نام اور میرا کام بھولنے نہ دینا۔ اللہ حافظ۔

آنیہ نے آنکھیں پونچھیں۔ خط کو تہ کر کے پھر سے بڑی احتیاط کے ساتھ دراز میں رکھا، کھڑکی میں آن کھڑی ہوئی۔ سردی کی یخ بستہ رات دھیرے دھیرے در و بام پر اتر رہی تھی۔ یہ گرم بستروں میں جانے کا وقت تھا۔ اس نے کھوئی کھوئی نظروں سے دور شمال کی طرف دیکھا۔ اس کی ”نگاہِ تصور“ کے سامنے کشمیر کی وادی آئی۔ اونچے اونچے برف پوش پہاڑوں کے درمیان کچھ گونجتی ہوئی آوازیں اس نے سنیں۔ بارود کی آوازیں، لہو کے بہنے کی آوازیں، اور للکارنے کی آوازیں...... اور پھر کچھ مناظر اس کے تصور میں ابھرے۔ کچھ سربکف مجاہد اپنے ہدف پر عقابوں کی طرح جھپٹ رہے تھے، پلٹ رہے تھے، پھر جھپٹ رہے تھے۔ وہ لہولہو تھے اور پکار رہے تھے۔ ”لے کے رہیں گے آزادی...... لے کے رہیں گے آزادی۔“

❖❖❖

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com